نظامِ زندگی

حصّۂ سوم

★

ناشر:
امامیہ مشن پاکستان (رجسٹرڈ) لاہور

سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور ۸۸

نظامِ زندگی

(حصّہ سوم)

سرکار سیّد العلماء علامہ سیّد علی نقی النقوی صاحب قبلہ

مجتہد العصر مدظلہ

قیمت ایک روپیہ صرف

امامیہ مشن پاکستان

کے مفید سلسلہ مطبوعات کا رسالہ ۹۸ "نظامِ زندگی" حصہ سوم آپ کے ہاتھوں میں ہے
جس کو ہم نے پہلی بار مئی ۱۹۶۰ء میں شائع کیا تھا یہ کتابچہ اپنی مقبولیت کی وجہ سے
بہت جلد ختم ہو گیا چنانچہ بہت تھوڑے عرصہ میں دوسری بار شائع کیا جا رہا ہے۔

اسلام کے پیش کردہ "نظامِ زندگی" کو مجتہدِ عصر نباضِ دہر، ناشرِ علومِ اسلام سرکار
سید العلماء مدظلہ نے مختصراً چار جلدوں میں مرتب فرمایا جس کو امامیہ مشن لکھنؤ نے شائع کیا
زیرِ نظر کتابچہ اس کے حصہ سوم کا پاکستانی ایڈیشن ہے اس سے پہلے اس سلسلہ کے دو حصے
اشاعت پذیر ہو کر جمہور سے سندِ قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اس کتابچہ میں سرکار
علامہ ممدوح نے اپنے مخصوص طرزِ نگارش کے ساتھ وضو کے فوائد حقیقتِ نماز
اور اجزائے نماز کے اسرار و مصالح پر حکیمانہ طرز سے تبصرہ فرماتے ہوئے نماز جیسی عظیم
عبادت کو عقل کی روشنی میں دیکھنے کا سامان فراہم کر دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اسلام
کی نمازِ عبودیتِ الٰہی کے مظاہرات کے علاوہ بنی نوع کے ساتھ بھی اخلاق اور حسن
معاشرت کی تعلیم دیتی ہے مذہب کو عقل کی روشنی میں سمجھنے کے طلب گاروں کے لئے
یہ پیشکش ایک حسین تحفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مومنین سے گذارش ہے کہ اس قابلِ قدر رسالہ
کو بنظرِ عمیق مطالعہ فرما کر نماز کو حقیقت شناسی کے ساتھ بجا لائیں اگر کسی ایک فرد نے
بھی اس سے کماحقہ استفادہ کیا تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری یہ خدمت بھی قبول ہو گئی ہے۔

والسلام

جنرل سکریٹری امامیہ مشن پاکستان لاہور
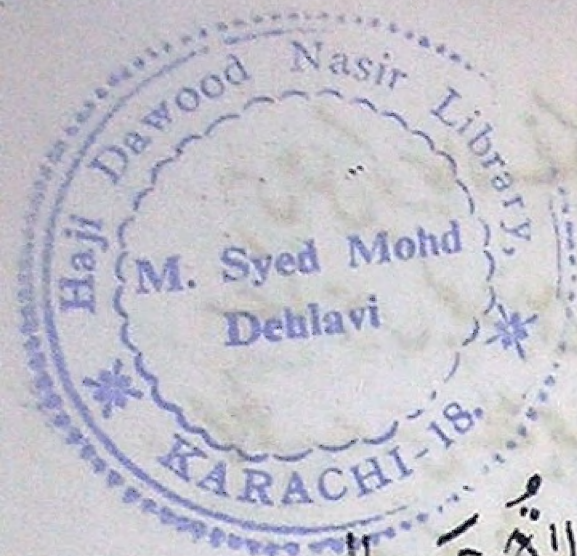
جنوری سنہ ۱۹۶۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِینَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الاَنبِیَاءِ وَالمُرسَلِینَ وَآلِہِ الطَّاہِرِینَ ط

سب سے پہلی عبادت

سب سے پہلی عبادت جو نیت کے ساتھ ادا ہوگی وہ طہارت ہے۔

عام حالات میں نماز کے لئے وضو کی ضرورت ہے۔ وہ "نماز" کے لحاظ سے تو واجب ہے۔ اور اسی لئے "واجب غیری" یعنی دوسری شئے کے اعتبار سے واجب کہا جاتا ہے۔ لیکن بجائے خود وہ مستحب ہے۔ اور اس کو بڑی فضیلت حاصل ہے۔

وضو کے فوائد

یوں تو احکام شرعیہ خصوصاً عبادات کے اصلی مقاصد و اغراض کو انسانی عقل سمجھ نہیں سکتی اور اگر اصلی مقصد و غرض انحصار کے ساتھ معلوم ہوجائے تو پھر وہ "عبادت" رہے ہی نہ بلکہ اب انسان کو صرف حصولِ مقصد پیش نظر رہے گی۔ خواہ وہ کسی طرح بھی ہو، اور "قربۃً الی اللہ"

اس عمل کو بجالانے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوگی۔" عبادت" کا راز تو اسی میں مضمر ہے کہ ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ اس کا اصلی منشا کیا ہے، مگر چونکہ ہمارے مالک کا حکم ہے اس لئے ہم اسے انجام دیتے ہیں۔

پھر بھی کچھ ضمنی فوائد احکام عبادت کے انسان کی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ ان فوائد و مقاصد پر تبصرہ کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ بیشک انہیں اصل بنیادِ حکم نہیں سمجھنا چاہئے اس لئے کہ ممکن ہے اس میں ان کے فوائد کے علاوہ بھی دوسرے مقاصد پیشِ نگاہ ہوں جن کو ہم پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے۔

اب ملاحظہ ہو کہ وضو میں ہوتا کیا ہے؟

چہرہ کا دھونا۔ دونوں ہاتھوں کا کہنیوں تک دھونا۔ اس کے بعد سر اور پیروں کا مسح، اور اگر آداب و مستحبات کے ساتھ وضو ادا ہو تو اس سب کے پہلے تین مرتبہ ہاتھوں کا گٹوں تک دھونا اور تین مرتبہ کلی کرنا۔ تین مرتبہ ناک میں پانی ڈالنا۔

یہ ظاہر ہے کہ شریعتِ اسلام کو براہِ راست جو شروع میں سابقہ پڑا تھا وہ عربوں کے ساتھ۔ پھر اس کے دائرہ کی وسعت میں بہت سے وہ اقوام داخل ہوتے ہیں جو عربوں ہی کی طرح جنگ جو ہوں یا وحشت کی زندگی بسر کرتے ہوں۔

عربوں کے معیارِ نظر کا اندازہ جو ان کے آثارِ قدیمہ یعنی اشعار سے

ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ جنگ و غارت کے سلسلہ میں صفائی اور پاکیزگی کا بالکل لحاظ نہ کرتے تھے بلکہ وہ میلے رہنے پر فخر کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو شنفری ازدی کا مقبولِ عام قصیدہ "لامیۃ العرب" جس میں اس نے بجیال خود مکارمِ اخلاق کی مثال پیش کی ہے اسمیں وہ خود اپنی تعریف میں کہتا ہے

وضاف اذا ھبت لہ الریح طیّرت   لبائد عن اعطافہ ما ترجّل

بعید بمس الدھن والفلی عھدہ   لہ عبس عاف عن الغسل محول

(یعنی) "میرے سر کے بڑے بڑے بال اس طرح ہیں کہ ہوا کی تحریک سے ان کے گچھے چاروں طرف اڑتے ہیں۔ اور ان میں کبھی کنگھی نہیں ہوتی۔ تیل کے پڑنے کو اور صفائی کو ایک عرصہ گذر گیا ہے۔ اور اس میں خشک میل جمع ہے جو ایک سال کا ہو گیا ہے۔"

اب اگر اُن کے سامنے اس مقصد کو پیش کیا جاتا کہ دیکھو صاف رہا کرو اور میلے نہ رہو تو وہ اُسے کوئی اہمیت نہ دیتے۔ اس لئے کہ ان کے مذاقِ طبع کے مطابق صفائی اور ستھرے پن کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔

لہٰذا اُن کے واسطے بطورِ عبادت ایسے احکام قرار دئے گئے کہ جن سے صفائی کا مقصد تو ضمناً حاصل ہو جائے اور اصل میں پیشِ نظر یہ ہو کہ یہ خدا کا حکم ہے اور بغیر اس کے نماز ایسی اہم عبادت جو رکنِ اسلام

ہے صحیح طریقہ سے انجام نہیں پاسکتی۔
اب اگر مخصوص صورتیں پیدا ہوں تو نہانا انسان کے لیئے لازمی قرار
گیا۔ اور یوں روزانہ ہر نماز کے لئے اسے باوضو رہنا ضروری ہوا اس
لیئے کئی دفعہ اس کے ہاتھ منہ دھل جائیں گے اور خصوصاً اگر آداب و
مستحبات کے ساتھ ہو تو کلیوں کے ذریعہ سے منہ کے اندرونی حصہ کی صفائی
ہو گی جب کہ اس کے ساتھ مسواک کی بھی بہت تاکید ہے اور اس درجہ
اس کو اہمیت دی گئی ہے کہ حضرت رسول ص نے فرمایا
لولا ان اشق علی امتی لامرتہم بالسواک "اگر مجھے اپنی امت پر
بہت شاق گزرنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں مسواک کو واجب قرار دیتا"
یہ مسواک وضو کے وقت علیحدہ پھر ہر نماز کے موقع پر الگ۔ غرض مختلف
بہانے قرار دئے گئے ہیں جن سے انسان کے لیئے صفائی و پاکیزگی کا مقصد
حاصل ہو۔

وضو کا ایک بہت بڑا فائدہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب انسان
پر نیند کا غلبہ ہو اور وہ نماز کے لیئے کھڑا ہونا چاہیے۔ اس موقع پر اگر یوں
ہی وہ نماز پڑھنے لگتا تو نیند کی غفلت اس پر بہت زیادہ ہوتی لیکن وضو کر
لینے سے نیند ہلکی ہو جاتی ہے اور انسان کو عبادت کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے
حدیث میں وضو کے ان تمام فوائد پر تبصرہ موجود ہے۔

امام رضاؑ فرماتے ہیں:- انما امر بالوضوء وبدئ بہ لان یکون العبد طاھرا اذا قام بین یدی الجبار عند مناجاتہ ایاہ مطیعا لہ فیما امرہ نقیا من الادناس والنجاسۃ مع ما فیہ من ذھاب الکسل وطرد النعاس وتزکیۃ الفؤاد للقیام بین یدی الجبار

"وضو کا حکم اس لئے ہوا ہے اور اس کو شروع میں رکھا گیا ہے تاکہ بندہ پاک و پاکیزہ ہو۔ اس وقت جب وہ اپنے مالک کے سامنے مناجات کے لئے کھڑا ہو رہا ہے اور اس کا اطاعت گزار ہو۔ اس حکم میں جو اس کو دیا گیا ہے اور گندگیوں سے پاک و صاف ہو اس کے علاوہ اس میں کاہلی کا دفعیہ اور نیند کا دور کرنا اور دل کا پاکیزہ کرنا بھی ہے مالک کے سامنے کھڑے ہونے کی غرض سے"

وضو کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ وہ صورت نماز کی جو مصلحت ادا کی جائے اور جس میں حقیقتاً نماز کا مقصد پورا نہیں ہوگا اس کے بھی بلا وضو بجا لانے کی ممانعت کی گئی ہے۔

ملاحظہ ہو مسعدۃ بن صدقہ کی روایت۔ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مخالفین کی جانب سے میرا گزر ہوتا ہے اس حالت میں کہ ان کی نماز جماعت منعقد ہے اور میں وضو کئے ہوئے نہیں ہوں۔ اب اگر

ہیں ان کے ساتھ نماز میں شریک نہ ہوں، تو وہ چہ میگوئیاں کریں گے۔ تو کیا یہ صورت صحیح ہے کہ میں ان کے ساتھ نماز پڑھ لوں۔ پھر وہاں سے واپسی کے بعد وضو کر کے اپنی نماز پڑھ لوں۔

امام نے فرمایا:- سبحان اللہ افما یخاف ان یصلی من غیر وضوٴ ان تاخذہ الارض خسفا۔ " اللہ اکبر! جو شخص بغیر وضو نماز پڑھے اس کو یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ زمین شق ہو اور وہ اس میں دھنس جائے"!

وضو کے لئے قرآنی ارشاد

قرآن مجید میں وضو کا حکم حسب ذیل الفاظ میں دیا گیا ہے:-

اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ وَاَیۡدِیَكُمۡ اِلَی الۡمَرَافِقِ وَامۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ اِلَی الۡكَعۡبَیۡنِ ؕ (سورۂ مائدہ)

"جب تم نماز کے لئے کھڑے ہونے لگو" اس سے وضو کے لئے وجوب غیری کا حکم ثابت ہوتا ہے یعنی یہ کہ اس کا وجوب بذات خود نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے فرض واجب یعنی نماز کی وجہ سے ہے۔ اسی لئے اس کے حکم کا مرنامہ ارادہ نماز کو قرار دیا گیا ہے کہ جب نماز کا تہیہ کرو "تو دھوؤ اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں کی حد تک"! ان ہی الفاظ کی بنا پر اہلِ سنت ہاتھوں کو الٹا دھوتے ہیں یعنی انگلیوں سے کہنیوں کی جانب پانی لیجاتے ہیں مگر ائمہ اہل بیت

نے جو شریعت الٰہیہ کے حقیقی ترجمان ہیں، یہ بتلا دیا ہے کہ ہاتھوں کے دھونے میں کہنیوں کی طرف سے ابتدا ہونا چاہیئے۔ اور یہی فطری طریقہ ہاتھوں کے دھونے کا ہے بھی۔ رہ گیا قرآن مجید میں "اِلَی الْمَرَافِقِ" اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ "اِلیٰ" غسل کی حد بتلاتا ہو۔ یعنی دھونا کہنیوں تک ہونا چاہیئے۔ اس صورت میں بے شک ابتدا انگلیوں سے اور انتہا کہنیوں پر ہونا ثابت ہوگا۔ لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ "اِلیٰ" مغسول کی حد بتلانے کے لئے ہے۔ یعنی وہ مقدار جو دھوئی جائے گی کہنیوں تک ہے۔ چوں کہ اس طرف انگلیاں آخر ہیں اور ان کے آگے کچھ ہے نہیں اس لئے حد بیان کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس طرف کہنیوں کے آگے بھی ہاتھ کی مقدار موجود ہے۔ اس لئے حد انتہائی کے بیان کی ضرورت ہوئی۔ اب اتنی مقدار کا غسل ہو کس طرح سے اُلٹا یا سیدھا، اس کو قرآن نے مجمل چھوڑ دیا ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ طبعی حیثیت سے جو انسان کی سمجھ میں آئے گا وہ سیدھا ہی دھونا ہے اُلٹا دھونے کے حکم کے لئے تصریح کی ضرورت ہے۔ بہر حال ہمارے ائمہ معصومینؑ کے حکم کے مطابق معیّنہ صورت یہی ہے کہ کہنیوں سے انگلیوں کے سرے تک دھویا جائے۔ اگر اس کے خلاف کیا جائے گا تو وضو باطل ہو گا پھر ارشاد ہوا ہے "اور مسح کرو اپنے سروں میں"۔ اگر "اِمْسَحُوْا رُؤُسَکُمْ" ہوتا تو یہ معنی پیدا ہوتے کہ سروں کا مسح کرے، اس صورت میں پورے سر کا مسح ہونا چاہیئے

ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کو مسح کے

تھا۔ لیکن چونکہ یہاں بِرُؤسِکُم

مگر محل مسح پورا سر نہیں ہے ائمہ معصومینؑ کا ارشاد

لئے ظرفیت حاصل ہے

سر کے آگے کا حصہ ہے اسی کے

ہے کہ مسح سر کے ایک خاص حصہ پر ہے اور وہ

زرارہ نے امام محمد باقرؑ سے دریافت کیا کہ یہ کہاں سے ثابت

اندر مسح ہونا چاہئے۔

ہوتا ہے کہ مسح سر کے بعض حصہ پر ہونا چاہئے تو حضرت نے ارشاد فرمایا:۔

عرفنا حین قال برؤسکم ان المسح ببعض الراس لمکان الباء یعنی

برؤسکم میں جو ب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسح سر کے بعض حصہ

پر ہے۔

اس کے بعد قرآن میں ہے "وَاَرْجُلَکُمْ" اس کو قرآن میں عام طور پر فتحہ کے

ساتھ اس طرح درج کیا گیا ہے وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ

اس پر اس طریقہ کی بنیاد قائم ہے کہ پیروں کو وضو میں دھویا جائے، اس طرح

یہ سابقہ فاغسلوا سے متعلق ہو جاتا ہے۔

ان لوگوں کے مذاق پر قرآن کی آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔

دھوؤ اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور مسح کرو اپنے سروں

کا اور پیروں کو یعنی پیروں کو دھوؤ۔

اس کے برخلاف اہلبیت کا مذہب یہ ہے کہ یہ برؤسکم پر عطف ہے اور

امسحوا کے تحت میں ہے جس کی بنا پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پیروں کا مسح ضروری ہے

اس کا فیصلہ تو یوں ہو جاتا ہے کہ ارجُلِکم کی قرأت خود اہل سنّت کے مسلمہ قرّاء سبعہ میں سے بھی بعض کی قرأت ہے اور چونکہ یہ امر مسلّم ہے کہ ان تمام قرّا کی قرأت متواتر ہے اس لئے اس قرأت کے تسلیم کرنے پر اہل سنّت بھی مجبور ہیں اور شیعہ بھی اس قرأت کے قائل ہیں۔ لہٰذا یہ متفق علیہ حیثیت رکھتی ہے لیکن ارجلکم لام کے فتحہ کے ساتھ شیعی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ارجلکم کا عطف قریبی جملہ کو چھوڑ کر سابقہ جملہ کے مفعول پر قرار دینا اگر بالکل غلط نہ بھی ہو جب بھی خلاف فصاحت ضرور ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس کا ترجمہ بھی کیسا مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ اس لئے علاّمہ فخرالدین رازی نے تو کہا ہے کہ اگر یہ ارجلکم نصب کے ساتھ ہو جب بھی اس کا عطف رؤسکم ہی پر قرار دینا چاہیئے۔ اس لحاظ سے کہ بروسکم میں اگرچہ حرفِ جر یعنی ب کی وجہ سے ظاہر میں کسرہ ہے مگر حقیقت میں وہ امسحوا کا مفعول ہے۔ اس لئے محل اس کا نصب کا ہے اور اس صورت میں نصب کے ساتھ اس پر عطف درست ہے۔ لہٰذا پیروں کا مسح ہی ضروری ہوگا غسل یعنی دھونا صحیح نہیں ہے۔

وضو کی متعلقہ دعائیں

اور مقصدِ شرع کی ترجمانی

عبادتوں میں جو شریعت کا اصلی منشا ہے اور جس قسم کے تصورات کا پیدا

کرنا منظور ہے اس کی تبلیغ اکثر ان دعاؤں کے ذریعہ سے کی گئی ہے جو اس عبادت کے وقت ماثور ہیں کیونکہ دعا کسی الفاظ کا پڑھنا نہیں ہے جو امام سے وارد ہوئے ہیں۔

تلاوت، ذکر، دعا یہ تین الفاظ الگ الگ ہیں۔ تلاوت کے معنی ہیں دوسرے کے کلام کو پڑھنا۔ اسی اعتبار سے کہ وہ دوسرے کا کلام ہے۔ ذکر، خود اپنی جانب سے خدا کے اوصاف کا ذکر کرنا اور اس کی تعریف و توصیف کرنا۔ مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اس کو جب ہم اس اعتبار سے پڑھیں کہ سورۂ حمد کا جزو ہے تو اس کا پڑھنا تلاوت ہوگا اور اگر ہم کہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ یہاں سبحان اللہ قرآن میں موجود ہے، الحمد للہ بھی موجود ہے اور لا الہ الا اللہ بھی ہے اور اللہ اکبر بھی فرض کیجئے کہ ہو لیکن پھر بھی ان کا پڑھنا اس موقع پر چونکہ بحیثیت آیاتِ قرآن نہیں ہے اس لئے وہ ذکر میں داخل ہوگا، تلاوت نہ ہوگا۔

دعا ان دونوں کے مقابل میں ہے۔ اس کے معنی ہیں خدا کی بارگاہ میں اپنی حاجات کو پیش کرنا۔ یہ دعا جب ہی ہوگی جب اس میں اس قسم کی خواہش شریک ہو۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سورۂ حمد میں پڑھا جائے تو وہ دعا نہ ہوگا۔ تلاوت کا جزو ہوگا۔ لیکن اس کو جب

ہم قنوت میں داخل کرکے اپنی طرف سے کہیں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ تو وہ دعا ہوگی جس کے معنی ہیں کہ بارِالٰہا ہم کو راہِ راست کی طرف ہدایت عطا فرما۔"

یوں ہی وہ ادعیہ جو کسی امام سے وارد ہوئے ہیں اگر اس اعتبار سے ان کو پڑھا جائے کہ وہ اس امام کا کلام ہے اور اسے ہم صرف پڑھ رہے ہیں تو وہ ہماری زبان سے دعا ہرگز نہیں ہوں گے۔ مثال کے طور پر صحیفۂ کاملہ کی کسی دعا کو آدمی یاد کرنے کی غرض سے بار بار دہرا رہا ہو تو اس وقت جو یہ پڑھ رہا ہے اسے اس شخص کی جانب سے دعا نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اس یاد کرنے کے بعد جب خود اس کو زبان پر لائے اپنی دعا کے قصد سے تو وہ دعا ہوگی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فرض کیجئے صحیفۂ سجادیہ نصابِ درس میں داخل ہو، استاد بحیثیت کتابِ درسی کے شاگردوں کے سامنے ان دعاؤں کو پڑھتا ہے، اس کا ترجمہ کرتا ہے، مطلب بتاتا ہے۔ یہ پڑھنا اس کا ہرگز دعا نہیں ہے۔

یوں ہی مثلاً صحیفۂ سجادیہ زیرِ طبع ہو۔ کاپی پروف کی مطابقت کے لئے مقابلہ ہوتا ہے۔ ایک شخص پڑھتا ہے دوسرا دیکھتا ہے۔ کیا یہ اس شخص کی جانب سے دعا ہے؟ ہرگز نہیں۔ دعا کا منشا یہ ہے کہ یہ شخص اس دعا کے

مضامین کو اپنی طرف سے بطور سوال پیش کرے اور ان مقاصد کے پورے ہونے کی خواہش کرے اس کا نام دعا ہو گا۔

یہ دعائیں جو مختلف اوقات و حالات میں وارد ہوئی ہیں ان کو صرف یہ سمجھنا کہ ان کے الفاظ میں اثر ہے یعنی جیسے دواؤں میں خاصیت ہوتی ہے یا جیس طرح منترول کے الفاظ میں تاثیر ہوتی ہے اس طرح ان دعاؤں میں بھی ہے، یہ ہرگز درست نہیں ہے۔

ان دعاؤں سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس فعل و عمل کے بجالانے کے وقت ایک شخص کے دماغ میں ان خیالات کو پیدا ہونا چاہیئے۔ اور اس کے دل میں ان جذبات کی فراوانی ہونی چاہیئے۔

اس لیئے ان کے معانی اکثر ان افعال یا اوقات سے مناسبت رکھتے ہیں جن کے لحاظ سے وہ دعائیں وارد ہوئی ہیں اگر صرف الفاظ ہی سے بحث ہوتی تو اس کی ضرورت نہ تھی یعنی کوئی عمل ہوتا ہاتھ سے متعلق اور دعا اس موقع پر پیروں کے لیئے ہوتی عمل ہوتا پیروں کا اور دعا زبان کے لئے ہوتی۔ یا صبح کے وقت دعا ہوتی جو رات کے متعلق ہے۔ یا رات کو ایسی دعا جو دوپہروں کا تذکرہ کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ جہاں تک دیکھا جاتا ہے ہر دعا میں اس چیز کی مناسبت موجود ہے جس کے لئے وہ دعا بتلائی گئی ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ صرف الفاظ مقصود نہیں ہیں بلکہ معانی کا لحاظ ہے اور وہ معانی ایسے ہیں جن کا اس حالت یا وقت پر تصور پیدا کرنا منظور ہے بے شک وہ اشخاص جو معنی سمجھ نہیں سکتے وہ تیمّن و تبرک کی غرض سے ان الفاظ کو زبان پر لائیں یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ ہمارے امام نے تعلیم دی ہے۔ اور اس میں ہماری جانب سے خدا کی بارگاہ میں کچھ عرائض ہیں، اتنا ہی تصور کریں تو اسے بالکل بیکار نہیں کہا جا سکتا۔ مگر دعاؤں کا حقیقی منشا تو جب ہی پورا ہو گا جب ان کے معانی کی طرف پورے طور پر توجہ ہو۔ اور انسان متاثر ہو کر اپنے دل کی تڑپ اور حقیقی جذبہ کے ساتھ ان دعاؤں کو زبان پر جاری کرے۔

وضو کے موقع پر اس وقت جب انسان کے سامنے پانی آتا ہے اور وہ اس کو چلّو میں لیتا ہے اس وقت دو چیزیں انسان کے سامنے پیش ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس وقت ایک شرعی فریضہ کو ادا کر رہا ہے۔ اور ایک کام انجام دینا چاہتا ہے۔ اسے توجہ ہوتی ہے کہ جو کام میں کروں اس کے تمام اسباب و ذرائع، اعضاء و جوارح اور ان کی طاقت، دل و دماغ اور ان کے خصوصیاتِ احساس و شعور جن سے ارادہ کا تعلق ہے یہ سب براہِ راست خداوندِ عالم کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اور اگر وہ ان قویٰ کو سلب کرے تو کوئی کام بھی عالمِ وجود میں

نہیں آسکتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ میری ذاتی طاقت مسلک طاعت و عمل پر گامزن ہونے کے لئے ناکافی ہے۔ جب تک کہ خدا میری مدد نہ کرے اس طرح جس کو کہتے ہیں توفیق، اسی کی مدد سے انسان اطاعت و عبادت کے مراحل طے کرتا ہے۔ اور اسی لئے جتنا بھی عبادت میں انسان جوش و انہماک سے کام لے وہ خداوند عالم کی بارگاہ میں اس کو بڑی حیثیت سے پیش نہیں کر سکتا۔ اور نہ وہ حق شکر کو خداوند عالم کے ادا کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ تمام اسباب و مقامات جن سے وہ اس عبادت کو بجالاتا ہے اور وہ تمام افعال و اعمال جنہیں بطورِ شکر ادا کرتا ہے وہ خود بھی خداوند عالم کے احسان و کرم کے رہینِ منت ہیں۔ اور اس لئے خود ان کے لئے اگر شکر ادا کیا جا سکتا ہے تو وہ خداوند عالم کا۔ دوسری چیز جو اس کے پیش نظر ہے وہ خدا کی خلق کی ہوئی ایک نعمت "پانی" ہے وہ دیکھتا ہے کہ اس پانی کو نظامِ حیاتِ انسانی میں کتنا دخل ہے۔ اور کتنے منافع اس سے وابستہ ہیں۔ خداوندِ عالم نے اس کو بہت کثرت کے ساتھ پیدا کیا اور پھر انسان کی راحت رسانی کے لئے اس کو طاہر و مطہر قرار دیا یہ اس کی وہ خصوصیت ہے جو شریعتِ اسلامی میں کسی دوسری چیز کے لئے نہیں پائی جاتی۔ اس کی وجہ سے انسان کو بڑی سہولت پیدا ہوتی ہے۔ انسان دونوں

مخلوط کیفیتوں کے ساتھ ایک طرف اس کام کا احساس جسے وہ انجام دیتا ہے اور
جس میں خدا کی مدد کی ضرورت ہے۔ اور دوسری طرف اس نعمت کے تصور
سے جو اس کے سامنے ہے یعنی پانی اور اس میں جو فوائد و برکات موجود
ہیں۔ کہتا ہے بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ الْمَاءَ طَهُوْرًا
وَلَمْ یَجْعَلْهُ نَجِسًا

خدا کی مدد سے اور خدا کے سہارے سے یعنی عبادت و اطاعت
کی منزل میں قدم رکھتا ہوں۔ صرف اس کی اعانت و توفیق کے بھروسے پر
پھر کہتا ہے کہ حمد ہے خدا کے لئے جس نے پانی کو طاہر و مطہر قرار دیا۔ اور اس
کو نجس نہیں قرار دیا۔

۲۔ وضو میں مضمضہ یعنی کلی کرنا مستحب ہے۔ کلی میں ہوتا کیا ہے پانی
دہن کے اندر حرکت کرتا ہے۔ انسان کا ذہن منتقل ہوتا ہے کہ دہن سے
بہت کیا چیزیں متعلق ہیں۔ دہن سے جس چیز کا بہت نمایاں تعلق ہے
وہ کلام ہے۔ مگر دنیا میں انسان کتنا ہی قوتِ تقریر رکھنے والا ہو اور
زبان آور، کیا فائدہ ہے؟ اگر یہ زبان بارگاہِ الٰہی میں جواب دہی
سے قاصر ہے۔ اور سوال کے موقع پر گنگ ہو جائے۔ قرآنِ مجید
میں روزِ قیامت کے متعلق بتلایا گیا ہے کہ لَا یَتَکَلَّمُ اَحَدٌ اِلَّا
بِاِذْنِہٖ "کوئی اس دن بات نہ کر سکے گا۔ مگر خدا کی اجازت سے" اور

دوسرے موقع پر صاف کہا گیا ہے لَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ
"نافرمان لوگوں کو کوئی اجازت نہ ہوگی۔ کہ وہ معذرت پیش کرسکیں"
زبان اس دن خاموش ہے۔ اس لئے حجت کوئی پاس نہیں ہے۔ مگر
اُس دن زبان کا کھلا ہونا یہ حقیقۃً وابستہ ہے دنیا میں اس زبان کے
صحیح طریقہ پہ جاری رہنے کے ساتھ کیونکہ وہاں کی جزا اور سزا یہاں کے
اعمال کے مطابق ہے۔ یہ زبان دنیا میں ذکرِ الٰہی میں مصروف رہے۔ یادِ
خدا سے غافل نہ ہو۔ سچ باتوں کے کہنے میں کوتاہی نہ کرے۔ پھر یہ ایک
کامیاب زبان ہے۔ اور انسان کے لئے کارآمد۔ اس لئے بندہ خدا سے
ان باتوں کا سوال کرتا ہے۔ عرض کرتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ لَقِّنِیْ حُجَّتِیْ یَوْمَ اَلْقَاكَ وَ اَطْلِقْ لِسَانِیْ بِذِكْرِكَ
"خداوندا مجھے حجت عطا فرما۔ یعنی مجھے اپنے سامنے جواب دہی
کی طاقت عطا فرما۔ جس دن میں تیرے سامنے حاضر ہوں اور میری زبان
کو جاری رکھ اپنے ذکر کے ساتھ"

۴۔ پھر استنشاق یعنی ناک میں پانی ڈالنے کا حکم ہے اس وقت
قوتِ شامہ کے ادراک کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ یہاں دنیا میں ہزاروں
قسم کے پھولوں کی خوشبو کا لطف میسّر ہے۔ اور اعلیٰ درجہ کے عطریات
شامہ کو فرحت بخشتے ہیں۔ لیکن روزِ قیامت اگر بوئے جنّت

سے یہ دماغ محروم کر دیا گیا تو یہاں کی تمام لذتیں خاک ہیں۔ چونکہ اکثر معاصی کی نسبت حدیثوں میں یہ تذکرہ ہے کہ جو ان کا مرتکب ہو وہ بُوئے جنّت نہ سونگھ سکے گا۔ یہ انتہائے محرومی کی ایک طرح کی تعبیر ہے اس لئے بارگاہ الٰہی میں یہ عرض کیا جاتا ہے۔

اَللّٰھُمَّ لَا تُحَرِّمْ عَلَیَّ رِیْحَ الْجَنَّۃِ وَاجْعَلْنِیْ مِمَّنْ یَّشُمُّ رِیْحَھَا وَرَوْحَھَا وَطِیْبَھَا۔

"بارالٰہا! نہ حرام قرار دینا میرے اوپر جنّت کی خوشبو کو اور قرار دینا مجھے اُن لوگوں میں سے جو بہرہ اندوز ہوں گے اُس کی خوشبو اور لطف و لطافت سے"

پہلا جزو آخرت کے ساتھ متعلق ہے۔ اور دوسرا جزو "مجھے اس جماعت میں سے نہ قرار دینا جس کے ساتھ یہ سلوک ہوگا" یہ دنیا سے متعلق ہے یعنی افعال و اعمال کے لحاظ سے میں اس جماعت کا فرد نہ ہوں۔ جو بوئے جنّت سے اپنی بداعمالیوں کے باعث محروم ہوگی؛

۴۔ اس کے بعد چہرہ پر پانی ڈالے گا۔ یہ پہلا واجب جزو ہے وضو کا۔ اس وقت چہرہ کا غبار دُور ہوتا ہے اور چہرہ صاف ہوتا ہے مگر اس وقت یاد آنا چاہیئے۔ کہ روزِ قیامت دو طرح کے لوگ ہوں گے کچھ وہ ہوں گے جن کے چہرے صاف اور نورانی ہیں وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَۃٌ ضَاحِکَۃٌ مُّسْتَبْشِرَۃٌ

اور کچھ چہروں پہ ہوائیاں اُڑ رہی ہوں گی۔ اور سیاہی دوڑ رہی ہوئی ہو گی
وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ أُولَئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ
الْفَجَرَةُ

ایک جگہ ارشاد ہوا ہے أَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللهِ
هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ "جن لوگوں کے چہرے سفید نورانی ہوں گے وہ خدا کی رحمت
میں ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

اس تفریق کا لحاظ کرتے ہوئے چہرہ دھوتے وقت دعا کی جاتی ہے۔

اَللّٰهُمَّ بَيِّضْ وَجْهِي يَوْمَ تَسْوَدُّ فِيهِ الْوُجُوهُ وَلَا تُسَوِّدْ وَجْهِي يَوْمَ
تَبْيَضُّ فِيهِ الْوُجُوهُ۔

"خداوندا میرے چہرہ کو روشن رکھنا۔ اس دن جس میں بہت سے چہرے سیاہ
ہوں گے اور میرے چہرہ کو سیاہ نہ بنانا اُس دن جب بہت سے چہرے روشن ہونگے"۔

۳۔ پھر داہنے ہاتھ کا غسل ہے اس موقع پر چونکہ ترتیب لازم ہے۔ اس لئے
داہنے کی خصوصیت ضرور سامنے آئے گی اور یہ تفریق پیشِ نظر ہوگی کہ روزِ قیامت
بعض لوگوں کو داہنے ہاتھ میں نامۂ عمل دیا جائے گا۔ یہ اچھے اعمال والے لوگ
ہوں گے اور بعض کو بائیں ہاتھ میں یہ بُرے اعمال کے لوگ ہوں گے۔

اس لئے یہ دعا کرے گا اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِي كِتَابِي بِيَمِينِي وَالْخُلْدَ فِي الْجِنَانِ
بِيَسَارِي وَحَاسِبْنِي حِسَابًا يَسِيرًا۔ خداوندا عطا کرنا مجھے نامۂ عمل میرے داہنے

ہاتھ میں اور جنت کی دائمی زندگی حاصل کرلے کو میرے لئے آسان قرار دینا اور مجھ سے بہت کم حساب کرنا"

۶۔ پھر بائیں ہاتھ دھونے کے وقت یہ دعا:۔

اَللّٰھُمَّ لَا تُعْطِنِیْ کِتَابِیْ بِشِمَالِیْ وَلَا تَجْعَلْھَا مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِیْ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ مُقَطَّعَاتِ النِّیْرَانِ۔

خداوندا، نہ عطا کر نامۂ عمل کو میرے بائیں ہاتھ میں اور ان ہاتھوں کو میری گردن کی طرف بندھا ہوا نہ قرار دینا اور میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں۔ آگ کی ہتھکڑیوں سے"۔

ہاتھوں کا گردن کی طرف بندھا ہونا کنایہ ہے عملی کوتاہیوں سے قرآن مجید میں ارشاد کیا ہے وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ

۷۔ پھر سر کا مسح ہے اس وقت یہ دعا پڑھے اَللّٰھُمَّ غَشِّنِیْ رَحْمَتَکَ وَبَرَکَاتِکَ وَعَفْوَکَ "خداوندا مجھے اڑھا دے اپنی رحمت اور برکتیں اور معافی"۔

۸۔ پھر پیروں کا مسح اس وقت یہ دعا پڑھے۔

اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْنِیْ عَلَی الصِّرَاطِ یَوْمَ تَزِلُّ فِیْہِ الْاَقْدَامُ وَاجْعَلْ سَعْیِیْ فِیْمَا یُرْضِیْکَ عَنِّیْ۔

"خداوندا ثابت قدم رکھ، مجھ کو صراط پر۔ اس دن جب قدم لڑکھڑاتے ہوں گے اور میری جدوجہد کو قرار دے ان باتوں میں جو تجھ کو مجھ سے رضامند رکھیں"۔

انسان جب اس دنیا میں فرائض و اعمال کے صراط کو صحیح طریقہ پر طے کرے گا۔ تو اُس عالم میں صراط یعنی جنّت کی گذرگاہ کو بہ آسانی طے کرلے گا۔ یہ انسان کے فرائض کی نزاکت ہی ہے جس کے لحاظ سے کہا گیا ہے کہ صراط بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ اُس پر ثابت قدم رہنا انسان کی جدوجہد اور خدا کی توفیق کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہ تصوّرات وہ ہیں جو وضو کے وقت پیدا کئے گئے ہیں اور آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ان سے انسان کی زندگی پر کتنا بہترین اثر پڑ سکتا ہے۔

نماز

یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے۔ جسے عمودِ دین یعنی مذہب کا ستون کہا گیا ہے۔ اگر غور کیجئے تو تمام مذہب عالم میں آپ کو عبادت کا ایک نہ ایک طریقہ ملے گا۔ مگر ہر عبادت کا طریقہ کسی ایک خاص حیثیت کا حامل ہے۔

کہیں مناجات و دعا ہے۔ اور کہیں کچھ خاص طرح کے افعال و حرکات ہیں۔ کہیں صرف سکوت اور سوچ کو عبادت قرار دیا گیا ہے مگر کوئی طریقۂ عبادت اتنا جامع ہمہ گیر اور مکمل نہیں جتنا اسلام کا طریقۂ عبادت نماز ہے۔

اس میں روح کی بھی شرکت ہے۔ اور جسم کی بھی۔ زبان سے بھی یاد ہے اور افعال و اعمال سے بھی۔ اقوال کی حیثیت میں حمد بھی اور تسبیح بھی۔ مناجات بھی ہے اور دعا بھی، افعال میں جتنے درجے اظہارِ خضوع اور تذلّل کے ہوتے ہیں سب موجود ہیں۔ مؤدب کھڑا ہونا اور پھر نصف قد سے جھکنا اور آخر میں پیشانی کا خاک پر رکھ دینا۔

ہرگز دنیا کے کسی مذہب میں سوائے اسلام کے اس طرح کا مکمل طریقۂ عبادت نہیں پایا جاتا۔

ایک زندہ مذہب کے لئے ایک اس طرح کا طریقہ ہونا ضروری ہے جو عبودیتِ خالق کا احساس پیدا کرتا رہے۔

یوں تو ہر شخص جن ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوا ہے اُن ہی کے مذہب کو اپنا مذہب کہتا ہے۔ مگر اُسی حد تک ہے کہ جب کوئی پوچھے کہ تمہارا مذہب کیا ہے تو وہ بتلا دے کہ میرا یہ مذہب ہے۔ مگر اس کا تصور اور خیال قائم رہنا ضروری نہیں ہے۔

اور ظاہر ہے کہ عقیدہ کا اثر انسان پر اتنا ہی زیادہ پڑ سکتا ہے۔ جتنا وہ زیادہ انسان کے پیشِ نظر رہے۔

مذہب کا اصل اصول اور بنیاد و روحانیت خدا کا اعتقاد ہے

انسان اپنے خدا کو یاد رکھے گا۔ تو اسے احساس پیدا ہوگا کہ مجھے کن صفات کا حامل ہونا چاہیئے۔ کون کام کروں۔ جن سے خدا خوشنود ہو۔ اور کون کام ترک کردوں تاکہ خدا ناراض نہ ہو۔ دوسری چیز آخرت کی یاد ہے۔ اس کا بھی اثر انسان کے افعال و اعمال پر پڑتا ہے۔

وہ انسان اپنے فرائض کو نظر انداز کر دیتا ہے جو دنیا کی آسائشوں میں مبتلا ہو کر آخرت کا خیال دل میں نہیں لاتا۔ مگر وہ بندگانِ خدا جن کے پیشِ نظر یہ ہے کہ ہم کو یہاں کے بعد ایک دوسرا عالم دیکھنا ہے جہاں اعمال کا حساب ہوگا۔ اور اچھے اور بُرے کاموں کا بدلہ دیا جائے گا۔ وہ کبھی اپنی ہوا و ہوس کی رَو میں آگے نہیں بڑھتے۔

اعتقادی و خیالی حیثیت سے یہ دونوں عقیدے انسانوں کی اصلاح کے لئے کافی ہیں۔ یعنی ان دونوں عقیدوں کے بعد ہر شخص کو یہ تصور پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ مجھے ایسے کام کرنا چاہئیں جن سے خدا رضامند ہو۔ اور آخرت میں مجھے سزا نہ ملے۔

مگر علمی حیثیت سے جب تک کوئی بتلانے والا نہ ہو کہ وہ کون راستے ہیں جن سے خدا رضامند ہوگا۔ اور جن سے آخرت کی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ اُس وقت تک اُن دونوں عقیدوں کا فائدہ مرتب نہیں ہو سکتا۔

وہ رسولؐ کی ذات ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان رابطہ قائم کرتی ہے۔ رسولؐ کے تعلیمات اپنے زمانہ کے لوگوں کے لئے تو بالمشافہ حاصل ہوتے تھے۔ اگر آپ کی وفات کے بعد آپ کی یاد دلوں میں قائم نہ رہے تو آپ کے وجود کے برکات آخری نسلوں تک نہیں پہنچ سکتے۔

ضرورت ہے کہ آپ کی بھی یاد قائم رہے۔ تاکہ آپ کے تعلیمات اور آپ کی سیرت سے بعد کی نسلیں اسی طرح فائدہ اٹھائیں۔ جس طرح آپ کے زمانہ کے لوگ خود آپ کی ذات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جن میں اسلامی نقطۂ نظر سے کسی افتراق کی گنجائش نہیں ہے۔ اور متفقہ حیثیت سے اسلام کے اصول اعتقادی ہیں۔ اسلام کا اہم فریضۂ نماز ان تینوں چیزوں کی یاد قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔ خالق کی یاد، روزِ آخرت کی یاد اور رسولؐ کی یاد، سب اس کی بدولت مسلمانوں کے دلوں میں تازہ ہوتی رہتی ہے۔

ہمارے نزدیک رسولؐ نے اپنے بعد کے لئے بھی کچھ ہستیاں چھوڑی تھیں جن کے افعال و اعمال تعلیماتِ الٰہی کے آئینہ بردار تھے۔ اُن کی یاد قائم رکھنے میں رسالت مآبؐ نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ اور وہ اہل بیت رسولؐ تھے۔ ہمارے نزدیک نماز میں ان کی یاد بھی قائم رکھی گئی ہے۔

وہ تشہد کے بعد درود کی منزل ہے جہاں ان کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اور ہم نہیں بلکہ امام شافعیؒ بھی اس کو جزوِ نماز سمجھتے ہیں۔ اور بغیر ذکر اہلبیت کے نماز کو باطل قرار دیتے ہیں۔

ان کا یہ شعر مشہور ہے۔

کفاکم من عظیم الفضل انکم

من لم یصل علیکم لا صلوٰۃ لہ

آپ کے لئے اے اہل بیت رسولؐ یہ فضیلت بہت کافی ہے کہ جو آپ پر درود نہ بھیجے اس کی نماز قابلِ قبول نہیں۔

یاد رکھئے کہ رسولؐ یا اہلِ بیتِ رسولؐ کی یاد قائم رہنے سے خود ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے انہیں تو اپنی ظاہری زندگی میں خود فائدہ کب پہنچا بلکہ انہیں تو پتھر کھانا پڑے خس و خاشاک پھینکے جانے کی توہین برداشت کرنا پڑی۔ اور وہ اذیتیں اٹھانا پڑیں کہ خود فرمایا ما اوذی نبی قط کما اوذیت کسی نبی کو وہ تکلیفیں نہیں پہنچائی گئیں جو مجھ کو پہنچائی گئیں ان کے ان خدمات و تعلیمات سے جو زندگی بھر انہوں نے انجام دئے خلق خدا کو فائدہ پہنچا۔ اور ان کی یاد قائم رہنے سے بھی خلقِ خدا ہی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے یہ اسلام کا حکم نماز ہے جو ان کی یاد قائم رہنے کا باعث ہے اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ کم از کم دن میں پانچ مرتبہ۔ اسے کوئی معمولی بات نہ سمجھے

کسی فارسی شاعر نے یہ مضمون کہا ہے کہ متواتر باراں کے قطرے جب پتھر پر گرتے ہیں تو اس پر بھی نشان بن جاتا ہے۔ قطرۂ باراں کی ہستی کو دیکھئے اور پتھر کے ایسے سخت جسم کو مگر مسلسل و متواتر چوٹ سے وہ پتھر پر اپنا اثر پیدا کرتا ہے۔

پھر یہ پے در پے کی یاددہانی جو نماز کے ذیل میں ہوتی ہے کیا خالی جاسکتی ہے؟ پتھر کا ایسا سخت دل بھی ہو تو ممکن ہے کبھی نہ کبھی ضرور متاثر ہو جائے۔

نماز کے ان مقاصد کا اظہار ائمہ معصومینؑ نے اپنے احادیث میں کیا ہے محمد بن سنان کا مراسلہ ہے امام رضاؑ کی خدمت میں جس میں کچھ مسائل دریافت کئے ہیں، اسی میں نماز کی مصلحت کا بھی سوال ہے حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا۔

اِنّ علّۃ الصّلوٰۃ انہا اقرار بالربوبیۃ للّٰہ عزوجل وخلع الانداد وقیام بین یدی الجبار جلّ جلالہ بالذّل والمسکنۃ والخضوع والاعتراف والطلب للاقالۃ من سالف الذنوب ووضع الوجہ علی الارض کل یوم اعظاماً للّٰہِ عزوجل وان یکون ذاکراً غیر ناس ولابطر ویکون خاشعاً متذللاً راغباً طالباً للزیادۃ فی الدین والدنیا مع مافیہ من الایجاب والمدن اومنۃ علیٰ ذکر اللّٰہ عزوجل باللّیل

والنها ر لئلا ینسی العبد سیدہ ومدبرہ وخالقہ فیبطر ویطغی ویکون فی ذکرہ لربہ وقیامہ بین یدیہ زجرالہ من المعاصی ومانعالہ عن انواع الفساد

نماز کی مصلحت یہ ہے کہ اس میں خداوند عالم کی ربوبیت کا اقرار ہے اور غیر خدا سے علیحدگی کا اظہار ہے اور خدائے جبار کی بارگاہ میں فروتنی اور انکسار کے ساتھ کھڑا ہونا ہے۔ اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور گذشتہ گناہوں کی معافی کی درخواست ہے اور چہرہ کا رکھنا ہے زمین پر ہر روز خداوند عالم کی عظمت کے اظہار کے لیئے۔ یہ ہے پہلا شعبہ میرے بیان کا جس میں میں نے ثابت کیا تھا کہ عبودیت کے جتنے طریقے ہیں وہ کس طرح جامعیت وہمہ گیری کے ساتھ نماز میں موجود ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اس نماز کے ذریعہ سے انسان کو یاد قائم رہتی ہے۔ اور وہ بھولنے نہیں پاتا اور نہ خودسر ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اپنے خدا کے سامنے سر جھکائے رہتا ہے اور اس سے دین و دنیا میں زیادتی کا طلب گار رہتا ہے۔ نماز کے ذریعہ سے رات دن ہر وقت بندہ کو خدا کا یاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ بندہ اپنے مالک اور مدبر اور خالق کو بھول نہ جائے اور سرکشی وخودسری میں مبتلا نہ ہو اور یہ کہ اپنے خدا کو یاد کرنے اور اس کی بارگاہ میں حضوری کے احساس سے وہ گناہوں سے باز رہے گا اور بہت سے نقصانات سے محفوظ رہے گا۔

اس میں نماز کو یادِ الٰہی کا ذریعہ بتلایا گیا ہے جو تمام عقائد کا سرنامہ اور اصل بنیاد ہے۔

دوسری روایت ہشام بن الحکم کی ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے نماز کا سبب دریافت کیا۔ حالاں کہ اس سے لوگوں کی ضرورتوں کا حرج ہوتا ہے اور جسمانی تکلیف بھی ہوتی ہے۔ حضرت نے فرمایا فیہا علل، نماز میں بہت سی مصلحتیں ہیں اگر لوگوں کو بغیر تنبیہ اور رسولؐ کی یاد کے چھوڑ دیا جاتا تو کیا ہوتا؟ کانوا علی ما کان علیہ الاولون فانھم قد کانوا اتخذوا دینا ووضعوا کتبا ودعوا اناسا الی ماھم علیہ وقتلوھم علی ذالک فدرس امرھم وذھب حین ذھبوا۔

مسلمان بھی پہلی امتوں کی طرح ہو جاتے جنہوں نے ایک دین بنا لیا۔ اور کتابیں ایجاد کر لیں اور لوگوں کو اپنے طریقہ کی طرف دعوت دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور لوگوں نے اس کی پیروی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سابق انبیاء کی تعلیم مٹ گئی۔ اور وہ خود ان کی زندگی کے ساتھ رخصت ہو گئی وارادالله ان لا ینسیھم امر محمد ففرض علیھم الصلوٰۃ یذکرونہ کل یوم خمس مرات ینادون باسمہ وتعبدوا بالصلوٰۃ وذکرالله لکیلا یغفلوا عنہ فینسوہ فیندرس ذکرہ خدا نے یہ چاہا کہ مسلمانوں کو حضرت محمد مصطفےٰ کی تعلیم فراموش نہ

روزانہ پانچ مرتبہ یہ سعل
ہونے پائے۔ اس لئے نماز کا فرض عائد کیا جس میں
کو یاد کر لیتے ہیں۔ اور اُن کے نام کا بلند آواز سے اعلان کرتے ہیں۔ اور ان
پر نماز اور ذکرِ الٰہی کی پابندی اس لئے عائد کی گئی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے
غافل نہ ہوں اور اسے بھول نہ جائیں جس سے اس کا ذکر محو ہو جائے؟
اس حدیث میں صاف طور سے نماز کو تعلیماتِ رسولؐ اور ذکرِ رسولؐ
کے بقا کا بھی ذریعہ بتلایا گیا ہے۔
بے شک یہ تعجب ہے کہ اس قائم اور برقرار یاد دہانی کے ساتھ مسلمان
خود نماز کے بارے میں تعلیم رسولؐ کو کیونکر بھول گئے جس کی وجہ سے یہ
اختلاف پیدا ہو گیا کہ نماز کا طریقہ کیا تھا۔ رسولؐ ہاتھ سینہ پر رکھتے تھے یا
زیرِ سینہ یا زیرِ شکم یا ہاتھ کھول کر پڑھتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا یہ
منشایہ تھا کہ رسولؐ کی یاد متفقہ طور پر قائم رکھی جائے۔ مگر کچھ در انداز لوگ
مسلمانوں میں ایسے آ گئے تھے جو قصداً رسولؐ کی تعلیم کو مشکوک بنانا چاہتے
تھے۔ لیکن جتنا بھی ان لوگوں نے اس سلسلہ میں کوشش کی ہو۔ پھر بھی وہ
مسلمانوں سے اصل نماز کو نہیں مٹا سکے۔ اور جب تک نماز دنیا میں قائم
ہے رسولؐ کی یاد بھی اس کے ساتھ قائم ہے۔

اوقات

نمازِ اصول دینیہ اور ارکانِ مذہب کی یاد قائم رکھنے کے لئے ہے۔

اس کے لئے ایسے اوقات کا انتخاب کیا گیا ہے جب وقت دماغ کشمکشِ دنیا سے کسی قدر علیحدہ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک ایسے موقع پر جب شور و غل برپا ہو، ہنگامہ ہو رہا ہو، آپ کسی سے کوئی بات کہئے تو وہ اس کو مشکل سے یاد رہے گی لیکن ایسے وقت جب تنہائی ہو، آپ ہوں اور وہ ہو اس وقت کچھ کہئے تو وہ اس کے ذہن نشین ہو جائے گا۔ اور وہ اسے زیادہ تر فراموش نہ کرے گا۔ اب دیکھئے ایک طرف صبح کی نماز کا وقت، یہ وہ موقع ہے کہ جب دنیا میں سناٹا ہے۔ اہلِ دنیا خوابِ غفلت میں ہیں اور پوری رات عیش و طرب میں گزارنے والے بھی اس وقت مائلِ خواب ہیں۔ اس وقت خدا کا بندہ مصلے پر اپنے خدا کو یاد کرتا ہے۔ دوسری طرف عشاء کی نماز، تمام نمازوں کے اصولوں کے خلاف اس میں تعجیل کے بجائے تاخیر کو افضل قرار دیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جتنا سونے کے وقت سے قریب ہو اتنا بہتر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں سکون چھا جائے، انسانِ خوابِ راحت کی طرف متوجہ ہونے کے پہلے خالق کو یاد کر لے۔

آج کل طبی حیثیت سے بھی تحقیق کیا گیا ہے کہ سونے کے وقت پر اور سو کے اٹھ کر جس نقش کو دماغ میں قائم کیا جائے وہ بہت مستحکم ہوتا ہے صبح اور عشاء کے لئے یہی دو وقت منتخب کئے گئے ہیں۔ اب رہ گئی

درمیان کی نمازیں اس کے لئے بھی بعد زوال کا وقت مقرر کیا گیا ہے۔ جس وقت دن کے حصّوں میں سب سے زیادہ سکون ہوتا ہے۔ طلوع آفتاب کے بعد اور غروب سے پہلے، صبح اور سہ پہر کے وقت دنیا کی چہل پہل اور رونق کے مابین دوپہر کا وقت ایک حد تک سناٹے کا ہے اس میں ظہر اور عصر کی نماز رکھی گئی۔

غروب آفتاب کا وقت، دن اور رات کی درمیانی منزل اس میں فطرتاً ایک خاص سکون ہوتا ہے جبکہ دریاؤں کی رفتار بھی ٹھہری ہوئی، ہوا میں بھی سکون، طائروں میں بھی خاموشی ہوتی ہے۔ اس وقت ایک نماز رکھ دی گئی ہے۔ یہ اسی لئے ہے کہ خالق کی یاد انسان کے دل و دماغ کو متاثر بنا سکے۔ اور اس میں احساسِ عبودیت قوت کے ساتھ پیدا ہو۔

پھر یہ دیکھئے کہ جس طرح جسمِ انسانی کے لئے ورزشیں ہوتی ہیں۔ ورزش کو دیکھئے تو اس میں کوئی ایک جزو خاص اثر اور فائدہ نہیں رکھتا۔ مگر ایک ہی عمل کی تکرار جسم پر اثر ڈالتی ہے معمولی سی چیز مشی یا چہل قدمی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ صحتِ جسمانی کیلئے مفید ہے اور اس کا اثر جسم پر پڑتا ہے مگر اس کا ہر جزو یعنی ایک ایک قدم وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک گام کوئی بھی وقعت نہیں رکھتا۔ مگر یہی گام جب متصل ہو جاتے ہیں اور پے در پے پڑتے ہیں

تو ایک ورزش کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اس سے انسان کے جسم کی تربیت ہوتی ہے۔

یوں ہی روحانی اور اخلاقی تربیت ہے۔ آپ ممکن ہے کہ ایک دفعہ کسی کی خاطر اپنی نیند کو اُچاٹ کر دیجئے۔ اس کا کوئی اثر نہ ہو گا۔ بلکہ ممکن ہے آپ کے نفس پر اس کا خراب اثر پڑے لیکن آپ برابر دوسرے کے لئے اپنی نیند کو خراب کرتے رہیں۔ اور عذر نہ کریں تو آپ کے نفس میں ایثار اور خدمتِ خلق کا وہ ملکہ پیدا ہو گا جو ہر ایک انسان میں نہیں پایا جاتا۔

عبادتِ خدا تقویٰ اور پرہیزگاری اور مذہبی حیثیت سے ہر انسانی کمال کا رمز ہے۔ نفسانی خواہشوں کا مقابلہ کرنا، اسی کو جہاد بالنفس کہا گیا ہے اور اسی کے لئے شاعر نے کہا ہے۔ ع

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا

یہ نماز حقیقتاً ایک ورزش ہے نفسانی خواہش سے مقابلہ کرنے کی۔ وہ صبح کا سہانا وقت، وہ وقت جب نسیمِ سحری کے جھونکے تھپک تھپک کر سلانا چاہتے ہیں۔ جب نرم بستر اور گرم تکیہ لیٹے رہنے کی دعوت دے رہا ہے۔ جس وقت ہم رنگی جماعت سوتے رہنے کی ترغیب دے رہی ہے، کیونکہ اربابِ دنیا اور اہلِ نشاط سب مصروفِ خواب ہیں۔ یاد رکھئے کہ جاگتے ہوؤں میں جاگنا مشکل نہیں۔ مگر سوتے ہوئے مجمع میں

اس وقت خدا کا بندہ بستر کو چھوڑ کر بیدار ہونا بہت دشوار ہے۔ اگر جاڑے کا زمانہ ہے تو ٹھنڈے پانی سے وضو کرتا کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور محراب میں آکر اپنے خدا کی عبادت میں مصروف ہو جاتا ہے ہے۔ کیا یہ فرض شناسی کی کوئی معمولی مشق ہے؟ اگر انسان اس میں پورے طور پر ثابت قدم رہے۔

نماز ختم ہوئی۔ اب انسان کو اپنے دنیوی کاموں میں لگ جانا چاہیے دن بنایا گیا ہے کسب معاش کے لئے۔ خود ارشاد کیا ہے کہ:۔

جَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۝

ہم نے رات اور دن کو اس لئے قرار دیا ہے کہ اس میں سکون اور آرام اختیار کرو۔ اور اس سے فائدہ حاصل کرو۔ مفسرین سے پوچھئے تو وہ بتلائیں گے کہ فائدہ حاصل کرنے سے مراد طلب معاش ہے۔

وہ لوگ جو نمازِ صبح کے لئے اٹھنے کے عادی نہیں ان کا دن کا بہت حصہ بھی سونے کی نذر ہو کر بیکار چلا جاتا ہے۔ مگر نمازِ صبح کی عادت دن کے کسی حصہ کو بے کار جانے نہیں دیتی۔ اب جائیے کسب معاش کیجئے۔ اس میں کوئی حارج نہیں ہے یہاں تک کہ ابتدائی نافلہ کی نماز تک کے لئے اس وقت کو مکروہ قرار دیا گیا ہے اب دوپہر تک کسب معاش کیا دوپہر بھر کے کام کے بعد مزدور بھی تھوڑی دیر کی چھٹی لیتے ہیں۔

دکاندار و کانوں ہتی پہ بھی کچھ دیر آرام کے لئے لیٹ جاتے ہیں۔ اب بے اختیار دل چاہتا ہے کہ کھانا کھایا ہے تو سو رہیں۔ آرام لیں۔ اس وقت ظہر کی نماز قرار دی گئی ہے۔ سونا ہے تو سو لینا بعد کو مگر اپنے خالق کی عبودیت کا احساس ہو تو ذرا بارگاہ میں حاضر ہو کر چار رکعت نماز پڑھتے جاؤ۔ ظہر کی نماز ہے اس کے بعد قیلولہ کیجئے۔ نافلہ کے لحاظ سے فریضۂ عصر کا وقت ہٹا کر رکھا گیا ہے۔ اور نافلہ کا وقت اتنا وسیع رکھا گیا ہے کہ اتنی دیر میں کچھ آرام بھی لیا جا سکتا ہے اور دل چاہے تو نافلہ بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ پھر اب کام کا وقت آ رہا ہے۔ بکری کا ہنگام ہے۔ جلدی ہے کہ جائیں اور سودا بیچنا شروع کریں۔ فرض کا احساس کہتا ہے کہ نہیں ابھی چار رکعت نماز عصر کی ادا کر لیں پھر جا کے اپنے کام میں لگیں۔ لیجئے اس کے بعد دن ختم ہوا۔ اور رات آ رہی ہے۔ رونق بازار ابھی ابھی شباب پر تھی۔ اور پھر رات کو چراغوں کی روشنی میں ابھی ابھی شباب پر آ جائے گی۔ ایک ذرا سا وقفہ جو چراغ جلنے کے وقت کا ہے اس وقفہ کو بیکار نہ جانے دو۔ مغرب کی نماز پڑھ لو۔ اب دکان بڑھا دی گئی ہے۔ دن بھر کا تھکا ماندہ انسان گھر آیا ہے۔ ممکن ہے کھانا بھی کھا چکا ہو۔ اب تو جماہیاں آ رہی ہیں۔ اور دل چاہتا ہے کہ کوئی کام نہ کریں اور بس سو رہیں مگر قانون کہتا ہے کہ ابھی عشاء کی نماز باقی ہے۔ چار رکعت

نماز پڑھو جس طرح دل چاہے۔ پھر آرام کی نیند سو۔ خدا کا بندہ کھڑا ہوتا ہے، چار رکعت نماز پڑھتا ہے اور اس کے بعد بستر پر جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دینوی اشغال کی منزل پر یادِ الٰہی کے پہرے بٹھلا دئے گئے ہیں، ہر مرتبہ کام شروع کرنے سے پہلے نماز، کام شروع کرنے کے بعد نماز، سو کر اٹھنے کے بعد نماز، سوتے وقت نماز اور جو اپنے دینوی اشغال کے ساتھ ان فرائض کے حق کو ادا کرتا رہے، یقیناً ایک کامیاب بندہ ہے۔ اور اسے خداوندی فرائض کے ادا کرنے میں نفس پر قابو حاصل ہو گیا ہے جس کے نتیجہ میں بہت سے معاصی کے ترک کرنے میں اسے کامیابی ہو سکتی ہے۔

یہ نتیجہ ہے نماز کا اسی لئے ارشاد ہوا ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ہ

ایک ضروری تشریح

اوقات نماز کی افادی حیثیت کے تذکرہ میں میں نے کاروباری افراد کو سامنے رکھا ہے۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو مقصدِ حیات کو پورا کرتے ہیں اور حرکت و عمل کے برکات سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ ان زندہ در گور انسانوں کا ذکر نہیں ہے جنھوں نے اپنی زندگی کو سکون و تعطل کی بدولت موت کا مرادف بنا لیا ہے۔ یہ اگر نمازیں بھی پڑھیں تو ان کی کوئی

خاص توصیف نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جو مقام مدح میں ارشاد ہوا ہے وہ یہ ہے
کہ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔
وہ لوگ کہ جن کو تجارت اور بیع ذکرِ خدا سے غافل نہیں کرتی۔ امامؑ نے
بتلایا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تجارت اور خرید و فروخت کرتے نہیں، یہ
غلط ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ تجارت اور خرید و فروخت کرتے ہیں اور پھر
بھی نماز اور ذکرِ الٰہی سے غافل نہیں ہوتے۔
یہی ہے خدا کی نگاہ میں قابلِ عزت اور اسی کی قرآن میں مدح ہوئی ہے

نماز کا اعلانِ عام یعنی اذان

جس طرح نماز خدا کے یاد دلانے کا ذریعہ ہے اسی طرح نماز کے یاد
دلانے اور بے خبر لوگوں کے با خبر بنانے کے لئے اذان کا حکم ہوا ہے۔
حضرات اہلِ سنت نے اذان کی تشریع کے سلسلہ کو وحیِ الٰہی
سے بالکل علیحدہ کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک وہ بعض صحابہ کے خواب
دیکھنے پر مبنی ہے۔
مگر شیعہ مذہب کے روایات کے مطابق عبادت کا کوئی جزو وحیِ الٰہی
سے جدا نہیں ہو سکتا۔
وہ ہرگز خواب و خیال پر مبنی نہیں ہوتا اور پھر خواب بھی اگر رسولؐ

کا خواب ہوتا تو اسے وحی کا ایک شعبہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ ایک عام انسان کا خواب اور اس پر رسولؐ کی طرف سے عبادت کی تشکیل۔ یہ ناممکن ہے۔
ہمارے یہاں اس باب میں جو روایت ہے وہ حسب ذیل ہے اسی سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اکثر مسلمانوں کو اس باب میں وحی کے انکار کی کیا ضرورت پیش آئی۔

منصور بن حازم کی روایت ہے۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں:۔

لما ہبط جبرئیل بالاذان علی رسول اللہ کان راسہ فی
حجر علی فاذن جبرئیل واقام فلما انتبہ رسول اللہ
قال یا علی سمعت قال نعم قال حفظت قال نعم قال
ادع لی بلالا فعلمہ فعلمہ۔

"جبرئیلؑ اذان لے کر رسالتمآبؐ پر نازل ہوئے تو اس وقت سر آپ کا حضرت علیؑ بن ابی طالب کی آغوش میں تھا۔ جبرئیلؑ نے اذان کہی اور اقامت کہی جب رسالتمآبؐ نے آنکھ کھولی تو پوچھا، یا علیؑ تم نے سنا؟ عرض کیا۔ ہاں۔ فرمایا، حفظ بھی کر لیا؟ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا، بلالؓ کو بلاؤ۔ انہیں تعلیم دے دیں۔ چنانچہ بلالؓ کو اذان و اقامت کی تعلیم فرمائی۔"

اس واقعہ میں حضرت علیؑ کی تھوڑی سی شرکت نے لوگوں کو آمادہ

کیا کہ وہ سرے سے وحی کا ہی انکار کر دیں چاہے اس سے شانِ رسالتؐ کو صدمہ پہنچ جائے۔

امام جعفر صادق سے مروی ہے:۔

انه لعن قوما زعموا ان النبی اخذ الاذان من عبد الله بن زید
آپ نے لعنت فرمائی اس گروہ پر جس کا خیال ہے کہ رسولؐ نے اذان کو عبداللہ بن زید سے اخذ کیا۔ آپ فرماتے تھے۔

ینزل الوحی علی نبیکم فتزعمون انه اخذ الاذان من عبد الله بن زید۔

وحی تو تمہارے پیغمبر پر نازل ہوتی تھی اور پھر بھی تم سمجھتے ہو کہ اذان کو عبداللہ بن زید سے اخذ کیا۔"

دوسرے مذاہب میں بھی اوقاتِ عبادت کے اعلان کے کچھ طریقے ہیں جیسے ناقوس یا باجا۔ سلاطین کے یہاں نوبت خانہ نقارہ وغیرہ۔ آپ کے یہاں کارخانوں میں مزدوروں کو عمل کی دعوت دینے کے لئے بھونپو کی آواز بلند ہوتی ہے۔ مگر وہ سب اپنے مقاصد کے لحاظ سے باوجود صدا رکھنے کے خاموش ہیں۔ یعنی جو شخص جانتا نہ ہو اس کو وہ خود نہیں بتا سکتے کہ وہ کس چیز کے منادی ہیں۔ کس مقصد کے حامل ہیں۔ اور کس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔

مگر اسلامی نماز کا اعلانِ عام جو اذان کے ذریعہ سے ہوتا ہے وہ اپنے
تمام مقاصد کا ترجمان ہے۔ اس میں صرف آواز ہی نہیں بلکہ الفاظ ہیں۔
اور وہ اپنی جماعت کے تمام خصوصیات کے حامل ہیں۔
سب سے پہلا جزو ہے اللہ اکبر۔ خدا کی ذات سب سے بڑی ہے۔ اس
میں اللہ کی بے انتہا عظمت کا اقرار ہے۔
کبیر کے معنی بڑا اور اکبر کے معنی کسی دوسری چیز سے زیادہ بڑا۔
اس میں ایک غیر کا تصوّر مضمر ضرور ہے مگر اللہ اکبر کے الفاظ میں
اس غیر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے اس کے معنی میں وسعت و
عمومیت پیدا ہو گئی ہے۔
غور کیجئے تو انسان بہت سی باتیں اپنے ضمیر اور حقانیت کے خلاف
کر گزرتا ہے۔ دوسری طاقتوں سے متاثر ہو کر اور وہ اسباب جن سے
ایک شخص دوسرے شخص کی طرف یا اس کے سامنے جھکتا ہے۔ تین ہیں
ایک لالچ، دوسرے خوف، تیسرے اس کی بزرگی کا احساس۔
لالچ کی وجہ سے دوسرے کی طرف جھکتا ہے۔ خوف سے دوسرے
کے سامنے جھکتا ہے۔ احساسِ بزرگی سے اس کی طرف میلان بھی ہوتا ہے
اور اس کے سامنے سر بھی خم ہوتا ہے۔
مگر ایک لالچ اسی وقت انسان کو متاثر بنائے گی جب اس سے

بڑی لالچ مقابل میں نہ ہو۔ ایک خوف اسی وقت متاثر کرے گا جب اس سے بڑا خوف نہ ہو۔ ایک عظمت اسی وقت مرعوب کرے گی جب اس سے بڑی عظمت نگاہ کے سامنے نہ ہو۔

اسلام نے چاہا ہے کہ تمام ان جذبات کے مقابلہ میں جو انسان کو حقائق کے خلاف عمل پر مجبور کرتے ہیں ایک ایسا احساس پیدا کیا جائے جو ان سب سے بالاتر ہو۔

لیکن اکبر کے لفظ کے بعد اگر کسی خاص شئے کا تذکرہ ہو جاتا تو معنی محدود ہو جاتے کیونکہ وہ شئے یا محل طمع ہوتی یا مورد خوف ہوتی یا مرکز عظمت سمجھی جاتی۔ مگر جب کہ کسی چیز کا تذکرہ نہیں ہوا تو اس میں ہمہ گیری پیدا ہوئی اب مطلب یہ ہے کہ اگر تم دنیا میں کسی چیز سے توقع رکھتے ہو تو یاد رکھو کہ سب سے بڑی توقع خدا کی ذات سے ہے۔ اگر کسی کا خوف رکھتے ہو تو یقین سمجھو کہ سب سے بڑا خوف خدا سے ہو سکتا ہے۔ اور اگر کسی کی ذاتی بڑائی سے متاثر ہو تو سب سے بڑی ذات خدا کی ہے اس لئے ہر وقت اس کی رضامندی کا خیال رکھو اور دنیا میں کسی کا خیال نہ کرو۔

اس سے انسان میں بے نیازی، آزاد منشی، خود اعتمادی اور خود داری پیدا ہوگی۔

وہ دنیا میں کسی غلط جذبہ سے متاثر نہ ہوگا۔ اور ہمیشہ حق گوئی

اور حق پرستی کو اپنا شعار رکھے گا۔

آپ دیکھئے تو نماز اور اس کے متعلقات میں اس تکبیر پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ وہ سرنامہ اذان بھی ہے، سرنامہ اقامت بھی اور سرنامہ نماز بھی۔ نماز میں ہر حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے کے موقع پر بھی تکبیر قرار دی گئی ہے۔ اور بطور تعقیب نماز کے خاتمہ پر بھی تین مرتبہ تکبیر کا حکم دیا گیا ہے۔

خود اذان میں تعداد کے لحاظ سے تمام اجزا پر اسے فوقیت دی گئی۔ دوسرے جزو اگر دو دو مرتبہ ہیں تو وہ چار مرتبہ شروع میں اور دو مرتبہ خاتمہ کے قریب۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے چار مرتبہ کس لحاظ سے قرار دیا گیا ہے۔ مگر ایک بلند منارہ پر کھڑے ہو کر اگر دور دور کے لوگوں تک آواز پہنچانا ہو اور ایک دفعہ اللہ اکبر مشرق کی طرف رخ کر کے ایک دفعہ مغرب کی طرف منہ کر کے، ایک دفعہ جنوب کی طرف متوجہ ہو کر اور ایک دفعہ شمال کی طرف کہا جائے۔ تو ہر سمت کے انتہائی حدود امکان تک یہ آواز پہنچ جائے گی کیونکہ آواز کا قاعدہ ہے کہ جس طرف رخ کر کے صدا دی جائے ادھر زیادہ دور تک جاتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعد کے اجزاء کی آواز جتنے کانوں تک پہنچ سکتی ہے اس سے زیادہ کانوں تک اللہ اکبر کی آواز پہنچائی جا سکتی ہے۔

اذان اور اقامت کے موقع کے علاوہ بھی صدرِ اوّل میں اس کی عظمت کا احساس رکھنے والے اس کا موقع بہ موقع استعمال کرتے تھے اور اس میں وہ ہیبت ہوتی تھی کہ اہلِ باطل لرزہ براندام ہو جائیں۔

امیر المومنین حضرت علیؑ بن ابی طالب کا قاعدہ تھا کہ جہاد میں جب کسی کو قتل کرتے تھے تو تکبیر کہتے تھے۔ چنانچہ لیلۃ الہریر میں آپ کی تکبیروں کے شمار کو ہی سے آپ کے مقتولین کی تعداد کا اندازہ کیا گیا۔

مگر یاد رکھئے کہ ہر شے کا غلط استعمال اس کی عظمت و اہمیت کو ختم کر دیتا ہے۔ مسلمانوں نے ایسے ایسے غلط موقعوں پر اس نعرہ کو زبان پر جاری کیا کہ اب اس میں کوئی وقعت باقی نہیں رہی۔ انتہا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ روزِ عاشورہ فرزندِ رسولؐ کے قتل پر بھی تکبیریں کہی جا رہی تھیں۔ ایک عرب شاعر نے کہا ہے:۔

ویکبرون بان قتلت وانما قتلوا بک التکبیر والتہلیلا

(اے حسینؑ) یہ لوگ آپ کے قتل پر تکبیریں کہہ رہے ہیں حالانکہ انہوں نے آپ کے ساتھ خود تکبیر و تہلیل کو قتل کر دیا۔

آج بھی مسلمانوں کی زبانوں پہ اللہ اکبر کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ بعض ایسے موقعوں پر جب ان کے حملوں کا رُخ مسلمانوں ہی کی طرف ہوتا ہے جس پر اسلام ملامت کرتا ہے اور دین و مذہب فریادی ہوتا ہے۔ خیر اس کو جانے دیجیئے۔ مسلمانوں کے غلط طرز عمل کی ذمہ داری اسلام پر تو نہیں ہے اور اس سے ہرگز اللہ اکبر کی اس عظمت و اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو واقعاً اس کو حاصل ہے۔

چار مرتبہ اللہ اکبر کہنے کے بعد دوسرا جزو ہے اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یہ توحید کے اس مسلک کا اعلان ہے جو اسلام کا حقیقی نصب العین ہے یوں تثلیث کے حلقہ بگوش توحید فی التثلیث کے پردے میں وحدت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور آریہ دھرم کے لوگ بھی موحد ہونے کے دعویدار ہیں۔ مگر سچی توحید کا پتہ اسلام کے سوا کہیں نہیں ہے۔ جہاں تک اللہ کے وجود کا اقرار ہے مشرکین بھی اس کے مُقِر تھے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى "ہم ان اصنام کی پرستش اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ کی بارگاہ سے قریب کردیں" اور خالق آسمان وزمین بھی وہ اللہ کو سمجھتے تھے۔ ارشاد ہوا ہے:۔

لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۔ اگر ان سے

پوچھو کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیا تو یہ کہیں گے اللہ نے"۔
مگر سوال اللہ کے ماسوا دوسروں کی نفی کا تھا۔ اسلام یہ کہتا تھا کہ جب خالق وہی ہے تو معبود بھی صرف اسی کو مانو۔ وہ کہتے تھے نہیں معبود ہم دوسروں کو بھی مانیں گے۔
آپ اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ "تولّا" میں تفرقہ نہ تھا جو کچھ اختلاف تھا وہ "تبرّا" یعنی بیزاری اور بے تعلقی میں۔ اسلام معبودانِ باطل سے بیزاری کا اظہار کرتا تھا اور یہاں سے خلیج افتراق پیدا ہوتی تھی۔ اسلام کے اس کلمہ میں کہ لا الہ الا اللہ اسی لئے نفی کو اثبات پر مقدم قرار دیا گیا ہے۔
اور دنیا اسی نفی کے نعرہ پر بھڑکا اگر کہا جاتا اللہ حق تو شاید سب اس کے کہنے کے لئے آمادہ ہوتے مگر اللہ کے سوا ہر ایک معبود کی نفی کا اعلان تھا۔ جسے قبائل عرب اپنے عقیدے پر ضرب کاری سمجھتے تھے اور اسی پر وہ برافروختہ ہوکر رسول سے برسرِ پیکار ہوئے۔ انہوں نے رسالتمآبؐ کو لالچ بھی دلایا۔ اور خوف بھی۔ تکلیفیں بھی پہنچائیں اور خون بہانے پر بھی آمادہ ہوگئے مگر رسولؐ کی زبان اس کلمۂ حق سے خاموش نہیں ہوئی۔ وہ صبر اور استقلال اور ثباتِ قدم کے ساتھ اسی کلمہ کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ دنیا ایک طرف اور وہ پیغامِ ربانی کا منادی ایک طرف اعلان کرتا ہوا کہ :۔
قُولُوا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوا کہو۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ تمہارا ہی بھلا ہوگا"۔

دُنیا نے دیکھا کہ مخالفتوں کا سیلاب آمڈا اور گذر گیا مزاحمتوں کی آندھیاں آئیں اور چلی گئیں مگر رسولؐ کے استقلال کا پہاڑ اپنی جگہ سے متحرّک نہ ہوا اور آخر وہی صدا جو فقط رسولؐ کے لب سے بلند ہو رہی تھی اور دُنیا اسے خاموش کرنا چاہتی تھی آج کتنے اعلان کے ساتھ ہر منارہ اور ماذنہ سے بلند ہوتی ہے اور دنیا سنتی ہے کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔

یہ فقرہ رسالتمآبؐ کی فتح کا اعلان اور اسلام کی حقانیّت کا نشان ہے اور اس لئے ضروری حیثیت سے اذان کا جزو قرار دیا گیا ہے۔

دو مرتبہ توحید کی گواہی دینے کے بعد پھر کہا جاتا ہے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفےٰؐ خدا کے پیغمبر ہیں!

یہ رسولؐ کی دائمی یاد ہے۔ خدا نے قرآن میں وعدہ فرمایا ہے فَاذْكُرُوْنِىْٓ اَذْكُرْكُمْ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ تم مجھے یاد کرو تو میں تمہیں یاد کروں گا۔ رسولؐ نے اپنی زندگی صرف کر دی خدا کی یاد کرنے میں تو خدا نے بھی ہمیشہ کے لئے اپنے ذکر کے ساتھ ان کا ذکر لازم کر دیا۔

پھر رسولؐ کا تذکرہ اذان میں بحیثیت خصوصیات ذاتی کے تھوڑی ہے جیسے آپ کا عرب خاندان سے ہونا، قبیلۂ قریش سے ہونا، مکّی و ہاشمی ہونا یا فرزند عبداللہ بن عبدالمطلب ہونا، بلکہ یہ تذکرہ تو اس منصب

کے لحاظ سے ہے۔ جو خدا کی طرف سے ان کو عطا ہوا تھا۔ اس لئے وہ حقیقتاً رسولؐ کے نام کا اعلان نہیں بلکہ اس پیغام کی حقانیت کا اعلان ہے۔ جو محمد مصطفےٰؐ کے ذریعہ سے دنیا کو پہنچا جس کا نام ہے شریعتِ اسلام۔

اس کے بعد جزوِ ایمان کی حیثیت سے نہیں مگر جزوِ ایمان ہونے کی حیثیت سے کسی قدرتی انتظام کے ماتحت مسلمانوں کے بہت بڑے طبقہ میں یہ رواج ہو گیا ہے۔ کہ وہ ''اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللهِ'' یا اس کے ہم معنی الفاظ بھی کہتے ہیں۔

''قدرتی انتظام'' میں اس لئے کہتا ہوں کہ اگر علمائے شیعہ نے اپنی کتابوں میں اس پر کوئی زور دیا ہوتا تو میں کہتا کہ یہ علماء شیعہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مگر علماء کا اس باب میں یہ عالم ہے کہ کوئی تو اجزائے اذان میں اس کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں کرتا اور کوئی تذکرہ کرتا ہے تو صاف لکھ دیتا ہے کہ یہ جزوِ اذان نہیں ہے۔ اس صورت میں فرقۂ شیعہ کی یہ ہمہ گیر سیرت ضرور ''قدرتی انتظام'' ہی کا نتیجہ ہے۔ بہر حال احتجاج طبرسی میں ایک روایت ہے جس کا مضمون یہ ہے۔

کہ جب بھی شہادتِ رسالت دو تو شہادت ولایت ضرور دو۔

اس عموم کے ماتحت اذان میں بھی شہادت ولایت کے کہنے کا حکم نکلتا ہے۔ اس بناء پر اس کو مستحبی جزوِ اذان کا سمجھا جاسکتا ہے۔

اب اس کے بعد وہ جزو ہے جو حقیقتاً نماز کی دعوت دینے والا ہے اور وہ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ ہے اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ نماز پر آمادہ ہو مگر جو لفظ اس کے لئے اختیار کیا گیا ہے اس میں حیات کا پہلو موجود ہے۔ اب اس کو یوں بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اپنے بے حس دل میں روحِ عمل پیدا کرو۔ اپنی موت کو حیات سے تبدیل کرو۔ بارگاہِ الٰہی میں نماز کی حالت میں حاضری دو۔

حَیَّ عَلَی الْفَلَاح یہ نماز کا نتیجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نماز تمہارے لئے رستگاری کا باعث ہے۔ آؤ اس عمل کی طرف جو خود تمہاری بھلائی اور رستگاری کا ذریعہ ہے۔

حَیَّ عَلٰی خَیْرِ الْعَمَلِ یہ اس عمل کے درجہ اور اہمیت کا تذکرہ ہے

یعنی اسے کوئی معمولی چیز نہ سمجھو یہ بہترین عمل ہے۔

تمام کتب اسلام سے یہ امر ثابت ہے کہ یہ جزوِ رسولؐ کے زمانہ میں اذان میں داخل تھا اور کہا جاتا تھا۔ بعد میں سیاسی مصالح کے ماتحت اس کو نکال دیا گیا۔ اس وقت جب مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی جا رہی تھی تو خیال کیا گیا کہ یہ اگر بہترین عمل نماز کو سمجھ لیں گے تو جہاد کی طرف رغبت کم ہو جائے گی۔ لہٰذا اس جزو کو حذف کر دیا گیا۔ مگر ہم تو رسولؐ کی تعلیم اور عمل کے پابند ہیں اور اسی لئے اس کو جزوِ اذان میں ضروری سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد پھر آخر میں دو مرتبہ اللہ اکبر ہے جس سے خدا کی بزرگی کا دوبارہ احساس پیدا کرایا جاتا ہے۔

خاتمہ پر دو مرتبہ لا الٰہ الا اللہ اس سے یہ مخصوص فائدہ حاصل ہوا ہے کہ اذان کی ابتدا بھی اسم اللہ سے ہوئی اور انتہا بھی اسم اللہ پر ہو گئی۔
اگر اللہ اکبر آخری جزو ہوتا تو آخر میں ذات کے بجائے صفت آتی لیکن لا الٰہ الا اللہ پر اختتام نے اللہ سے ابتدا اور اللہ پر انتہا کر دی۔ اور بتلا دیا کہ ھُوَ الْاَوَّلُ وَھُوَ الْاٰخِرُ مِنْہُ الْمُبْتَدَاءِ وَاِلَیْہِ الْمَعَادِ۔

اقامت

اقامت میں بھی تقریباً یہی اجزا ہیں۔ صرف شروع میں اللہ اکبر یہاں دو مرتبہ اور آخر میں لا الہ الا اللہ ایک مرتبہ ہے۔ بے شک چونکہ اذان دور والوں کو نماز کا اعلان کرکے پاس بلانے کے لئے ہے اس لئے نماز کے متعلق وہاں صرف یہ فقرہ ہے حیّ علی الصلوٰۃ نماز کے لئے آمادہ ہو۔

آمادگی کے حدود مختلف ہیں۔ اور کوئی دور رہتا ہے کوئی نزدیک اس لئے اذان میں ٹھہر ٹھہر کر کہنا اور ترتیل یعنی بڑھا بڑھا کر زمزمہ کے ساتھ الفاظ کا ادا کرنا بہتر ہے۔ اور اس میں الفاظ کا بلند ہونا بھی افضل ہے۔ مگر اقامت وہ نماز کا قریب ترین پیغام ہے جو اُن لوگوں کو جو پاس موجود ہیں بلا انتظار نماز کے لئے کھڑے ہونے کی دعوت دیتا ہے اس لئے یہاں ایک جزو کا اضافہ ہے۔

حی علی الصلوٰۃ۔ حی علی الفلاح۔ حی علی خیر العمل دو دو مرتبہ کہنے کے بعد دو مرتبہ قَدْ قَامَتِ الصَّلوٰۃ

یعنی بس اب کوئی انتظار نہیں اب نماز قائم ہو ہی گئی ہے اس لئے بہتر ہے کہ اس کے کہتے ہی صف باندھ کر کھڑے ہو جائیں اور پھر تاخیر نہ ہو۔ اس کے بعد اصل نماز شروع ہو جاتی ہے اور بس۔

نماز کے شرائط

نماز کے لئے کچھ اجزا ہیں اور کچھ شرائط۔

(پہلی شرط) طہارت ہے۔ جس کا تذکرہ اس کے قبل (نظامِ زندگی حصہ دوم) میں ہو چکا ہے۔

(دوسری شرط) ہے وقت۔ نمازِ پنجگانہ کے لئے مخصوص اوقات مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ اس وقت سے پہلے وہ نماز نہیں بجالائی جاسکتی اور وقت گزرنے کے بعد اس نماز کے ادا کرنے کا موقع باقی نہیں رہتا۔ قضا تو ایک نیا فرض ہے جو بالتعین وقت عائد ہوتا ہے۔ اس کا اصل نماز کے حکم سے جو وقت کے ساتھ وابستہ تھا۔ کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہر نماز کی ادا کے لئے یوں تو شرع کی جانب سے کافی وسیع وقت دیا گیا ہے۔ نمازِ صبح کے لئے صبح صادق سے طلوع آفتاب تک۔

ظہر و عصر کے زوال سے غروب تک۔ مغرب عشا غروب سے نصف شب تک۔ مگر تاکید ہے اس کی کہ ہر نماز کو وقت آنے کیلئے ساتھ ہی پڑھ لے۔ اس میں خواہ مخواہ دیر کرنے کی بڑی مذمت کی گئی ہے اور قرآن مجید میں جہاں جہاں حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰاتِ کی طرح کے الفاظ ہیں، وہاں حفاظت سے مراد یہی لیا گیا ہے کہ نمازوں میں اول وقت کا خیال رکھا جائے ——

ایک حدیث میں جو جناب رسالتمآبؐ سے منقول ہے وارد ہوا ہے کہ

من صلی الصلوٰۃ لغیر وقتھا رفعت لہ سوداء مظلمۃ تقول ضیعتنی ضیعک اللّٰہ کما ضیعتنی۔ جو نماز کو اس کے مقررہ وقت کے خلاف پڑھتا ہے تو وہ نماز بلند ہوتی ہے اس طرح کہ سیاہ اور تاریک ہوتی ہے اور وہ کہتی ہے کہ تو نے مجھے برباد کر دیا ہے۔" انتہا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ فرماتے ہیں لاینال شفاعتی غدا من اخر الصلوٰۃ المفروضۃ بعد وقتھا۔

"میری شفاعت کا حقدار نہیں وہ جو نماز میں اس کا وقت آنے کے بعد تاخیر کرے۔"

امام جعفر صادقؑ کی روایت ہے کہ یہ الفاظ رسولؐ نے اس وقت ارشاد فرمائے جب مرض الموت میں مبتلا تھے غشی کا عالم تھا جو افاقہ ہوا تو یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

عبرت کا مقام ہے کہ آج سب سے زیادہ یہ کمزوری شیعہ فرقہ میں پیدا ہو گئی ہے، ہماری امتیازی خصوصیت یہ ہو گئی ہے کہ ہم نماز کے اوقات فضیلت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ حالاں کہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

امتحنوا شیعتنا عند ثلث عند مواقیت الصلوٰۃ کیف محافظتھم علیھا وعند اسرارھم کیف حفظھم بھا عند عدونا والی موالیھم

کیف مواساتھم لاخوانھم فیھا

ہمارے شیعوں کا تین باتوں میں امتحان لو۔ اوقات نماز کی پابندی کیسے کرتے ہیں۔ اور اپنے رازوں کی حفاظت دشمنوں سے کس حد تک کرتے ہیں اور ہم اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ کس قدر ہمدردی رکھتے ہیں۔

افسوس ہے کہ آج یہ سب صفتیں دوسروں میں پائی جاتی ہیں اور ہمارے افراد ان صفتوں سے محروم ہیں۔

ایک روایت میں صرف پہلے امر کا تذکرہ ہے۔

امتحنوا شیعتنا عند مواقیت الصلوٰۃ کیف محافظتھم علیھا

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شیعوں کا یہ خاص طرۂ امتیاز تھا اور دوسرے لوگ اس میں کوتاہی سے کام لیتے تھے۔ لیکن اس کے بعد ہماری دیکھا دیکھی دوسرے نے یہ صفت اختیار کر لی اور ہم تن آسانی اور عیش پسندی میں پڑ کر اس جوہر سے عاری ہو گئے۔

معلوم ہونا چاہئے کہ اگر کوئی شخص نماز کے وقت کا سختی سے پابند ہے تو اس کے سب کام اوقات کی پابندی کے ساتھ انجام پائیں گے۔ اسے اپنے کاموں میں ترتیب اور ضبط نظام کی عادت ہو گی اور اس طرح بہت سے کام وہ قاعدہ کے ساتھ انجام دے سکے گا، لیکن اگر نماز کے وقت کا پابند نہیں ہے تو پھر اپنے کسی کام میں بھی وہ اوقات کی پابندی

نہیں کر سکتا۔ نتیجہ اس کا ہوگا کاموں کی بے ترتیبی اور اوقات کی بربادی۔

قبلہ

یہ نماز کی تیسری شرط ہے۔ قبلہ کے معنی ہیں وہ شے جس کی طرف انسان رخ کرے۔ اسلام نے نماز کے لئے اپنے افراد میں ہم رنگی و ہم آہنگی قائم کرنے کے لئے یہ حکم دیدیا ہے کہ نماز میں ایک خاص سمت کی طرف رخ کرکے کھڑے ہوں اور وہ خانہ کعبہ کی جہت ہے۔ ہجرت کے بعد شروع شروع یہ حکم ہوا تھا کہ بیت المقدس کو قبلہ بنایا جائے، مگر اس کے بعد قانون میں تبدیلی ہوگئی اور ہمیشہ کے لئے کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا گیا۔

غیر مسلمین اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام بت پرستی کی مخالفت کا دعویدار ہے اور توحید کا واحد علمبردار کہا جاتا ہے مگر کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے میں اسی طرح شرک کی بو پائی جاتی ہے جس طرح بت کو سامنے رکھ کر عبادت کرنے کو شرک کہا جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح کا اعتراض سجدہ کے باب میں غیر شیعہ مسلمانوں کی طرف سے شیعوں پر کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ خاکِ شفا کی سجدہ گاہ سامنے رکھ کر نماز پڑھتے ہیں۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے بت پرست کو سامنے رکھ کر مشرکین عبادت بجالاتے ہیں۔

اگرچہ سجدہ کا بیان اس کے بعد ہوگا مگر اعتراض و جواب کی نوعیت یکساں ہونے کی وجہ سے یہیں اسے بھی صاف کر دوں گا تاکہ پھر اس کے بعد مجھے اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہ ہو۔

دیکھنا یہ ہے کہ شرک کا معیار کیا ہے؟ شرک یہ ہے کہ کسی ایسی صفت یا ایسے عمل کو جو خدا کے ساتھ مخصوص ہو اس کے غیر کی طرف منسوب و متعلق کر دیا جائے۔

پہلی صورت یعنی کسی صفت کو جو خدا سے مخصوص ہو غیر کے لئے ثابت کرنا شرک فی الاعتقاد ہے جیسے قدم ذاتی، وجوب، خالق، رازق وغیرہ اوصاف کو خدا کے سوا کسی اور کے لئے قائل ہونا اور دوسری صورت یعنی کسی عمل کو جو خدا سے مخصوص ہو غیر کے لئے بجا لانا شرک فی العبادت ہے۔

اب دیکھئے کہ یہ چیزیں جن کو شرک کہا جا رہا ہے کیا خدا کے لئے ثابت ہو بھی سکتی ہیں؟ قبلہ کیا ہے؟ وہ چیز جو نماز پڑھتے وقت انسان کے سامنے ہو۔ ظاہر ہے کہ نماز کے وقت انسان کے سامنے کوئی مادی ہی چیز ہوگی خواہ دیوار ہو، یا در ہو، یا درخت ہو یا پہاڑ ہو، کوئی جہت ضرور ہوگی خواہ وہ غرب ہو یا شرق ہو، جنوب ہو یا شمال؛ خدا وند عالم جسم و جسمانیات سے مبرا و منزہ ہے اور کسی جہت و سمت میں نہیں۔ اس لئے چہرہ کے سامنے وہ

ہو ہی نہیں سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ خدا جسمانی حیثیت سے انسان کا قبلہ نہیں ہو سکتا اور یہ صفت اس کے لئے ثابت ہی نہیں قبلہ تو بہرحال غیر خدا ہی ہوگا۔

خواہ وہ معین چیز ہو یا غیر معین۔ پھر کسی ایک معین چیز کو قبلہ بنانے سے شرک کیسے لازم آسکتا ہے۔ اسی طرح پیشانی کے نیچے سجدہ کی حالت میں بہرحال کوئی نہ کوئی جسم ہوگا وہ خاک ہو یا پتھر، لکڑی ہو یا کپڑا یا کوئی اور چیز، خدا تو کبھی معاذ اللہ انسان کی پیشانی کے نیچے ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر کسی معین چیز کو محل سجدہ قرار دے لینے کو شرک سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

حقیقتاً شرک تو یوں ہوگا کہ ہم عبادت کو خدا کے حکم اور اس کی اطاعت بندگی کے لحاظ سے نہ بجالائیں بلکہ کسی اور چیز کی عظمت سے متاثر ہو کر سر خم کردیں یہ شرک ہوگا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ مسلمان جو کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں وہ ہرگز کعبہ کی عظمت سے متاثر ہو کر اس کے سامنے سربسجود نہیں ہوتے ہیں بلکہ صرف اس بنا پر کہ خدا کا حکم ہے وہ کعبے کے سامنے رخ کر کے عبادت کرتے ہیں اور اسی لئے جب تک خدا کا حکم بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا تھا اس وقت تک اُدھر متوجہ ہوتے تھے اور جب کعبہ کی طرف حکم ہو گیا تو ادھر مڑنے لگے شاید تبدیلِ قبلہ میں ایک خاص مصلحت یہ بھی ہو اور آیت قرآن

ہیں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

"بے عقل لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس قبلہ سے کہ جدھر نماز پڑھتے تھے کیسے روگرداں ہوئے کہو کہ مشرق و مغرب دونوں خدا کے ہیں، وہ جسے چاہتا ہے صحیح راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے"!

مطلب یہ ہے کہ ہماری نگاہ میں نہ مشرق کو کوئی خصوصیت ہے نہ مغرب کو۔ ہم تو خدا کے حکم کے پابند ہیں۔ جدھر وہ مڑنے کو کہہ دیتا ہے ادھر مڑ جاتے ہیں۔ اس بنا پر نماز اگرچہ کعبہ کی طرف رخ کر کے پڑھی جاتی ہے مگر وہ ہرگز کعبہ کی عبادت نہیں ہے۔ عبادت وہ اس خدا ہی کی ہے جس کی اطاعت اور بندگی اس عمل میں مدنظر ہے۔

اصنام کو سامنے رکھنے والے ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ انہیں خالق نے کوئی حکم دیا ہے کہ وہ ان بتوں کو اپنے سامنے رکھا کریں بلکہ وہ اپنے پوجا کو ان ہی مورتیوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ان کو قابل عظمت سمجھتے ہیں جب کہ پیغمبروں کی زبانی ان کو برابر اس کی ممانعت ہوتی رہی ہے مگر وہ اس حکم الٰہی کے مقابلہ میں اپنے دل سے برابر اصنام کی پرستش کرتے رہے اس لئے یہ پرستش خدا کی عبادت کے مقابل ٹھہری اور شرک قرار پائی۔

نظام زندگی

پیشانی کے نیچے بھی جب کہ بہرحال کوئی نہ کوئی جسم ہوگا تو اگر ہمیں قانون کے رو سے کسی خاص چیز کا پابند بنا دیا گیا جو ہمارے نزدیک بواسطۂ رسولؐ خدا کے حکم سے متعلق ہے تو اس سے عبادت غیر خدا کی کب ہو جائے گی۔ عبادت تو وہ خدا کی ہوگی جس کے حکم سے ہم خاک یا درخت کے پتے یا لکڑی پر سجدہ کرنے کے پابند ہوئے ہیں۔ حکم الٰہی کے ماتحت بھی کسی غیر خدا سے عبادت کا کسی طرح کا تعلق اگر شرک ہوتا تو ابلیس لعین سب سے بڑا موحد ٹھہر تا کیونکہ اس کا جرم یہی تھا کہ اس نے غیر خدا کو جو سجدہ کا حکم ہوا تھا اس کی اطاعت نہ کی۔ خدا کو وہ لاکھوں سجدے کر چکا تھا۔ مگر آدم کے سامنے سر نہ جھکایا۔ وہ مغضوب و مردود ہوا۔ اور اس لئے کہ اب آدم کا سجدہ خدا کے حکم کے ماتحت عبادت خدا قرار پا گیا تھا۔ وہ سجدہ تو آدم کے لئے تھا۔ مگر عبادت اس خدا کی تھی جس کے حکم سے انجام پا رہا تھا۔ اب یہ سجدہ کرنا شرک نہیں تھا بلکہ سجدہ سے انکار کرنا کفر ہو گیا۔ اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ۝

پھر کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو خدا کے حکم کی بنا پر کسی چیز کی تعظیم کرتے ہیں یا اس کے اوپر سجدہ کرنا لازم سمجھتے ہیں، وہ خدا کے سوا کسی اور کی عبادت کر رہے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر قبلہ کے لئے ایک خاص سمت کو مخصوص کر دینے کی وجہ کیا ہے؟ میں بحث کی ابتدا میں اجمالاً اس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں اور اب تفصیل بیان کرتا ہوں کہ مختلف افراد میں اتحادِ عمل اور یک رنگی ذہنیت اور خیالات میں یگانگت اور استحکام کا باعث ہوتی ہے۔

آج دنیا کے ممالک اس کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہ وہاں کے لوگوں میں اتحادِ شکل، اتحادِ زبان اور اتحادِ لباس پیدا ہو۔

یہ بڑی ناسمجھی کی بات ہے کہ اسلام کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسلام کی کوئی زبان نہیں، اسلام کا کوئی لباس نہیں۔ اسلام کی کوئی معاشرت نہیں۔ یاد رکھئے کہ اگر ممالک اپنی وحدت کو مستحکم کرنے کے لئے زبان اور لباس اور معاشرت کے اتحاد پر زور دیتے ہیں اور یہ عقلی حیثیت سے صحیح ہے تو اسلام بھی اگر اپنے ماننے والوں کو ان باتوں میں کسی ایک شکل، صورت اور ہیئت کا پابند بنائے تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ وہ ان تمام نسلی، قومی، جغرافیائی حدود و خطوط سے نکل کر ایک محدود قومیت کی تشکیل کرے جس میں وسعت و ہمہ گیری کی صلاحیت ہو اس متحدہ بنیادوں کو مضبوط کرنے کیلئے افعال و اعمال میں ہم رنگی و یکسانی کی ضرورت تھی اور اس کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ عبادات ہوں اور خواہ معاملات اس طرح کی قانونی پابندیاں عائد کی گئیں جن کی وجہ سے مطلق العنانی اور طوائف الملوکی

ختم ہو جاتی ہے۔ اور سب ایک رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ یہ بات بہت
وسیع ہے۔ اور اسلام کے بہت سے احکام اس کلیہ پر منطبق ہوتے ہیں
جن پر موقع بہ موقع روشنی ڈالی جائے گی۔
قبلہ کے لئے ایک خاص سمت کی پابندی اس اجتماعی مقصد کا بہت
بڑا رکن ہے۔ دیکھئے تو کہ اگر قبلہ مخصوص نہ ہوتا تو ایک وقت میں چند
آدمی نماز پڑھنے والے کوئی کسی طرف رُخ کئے ہوتا اور کوئی کسی طرف
کیا اس میں وہ اجتماعی شان پیدا ہوتی ہے جو نماز جماعت کے ہزاروں
افراد کی بوقت واحد ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ صفِ جماعت میں
کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کے دِل پر نماز جماعت کی شان و عظمت
کا اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا دور سے کسی بلندی پر کھڑے ہو کر کسی
کثیر التعداد مجمع کی نماز باجماعت کو دیکھ کر دل پہ ایک اثر پڑتا ہے۔
قبلہ کے لئے کسی جہت کی تعین نہ ہونے سے یہ مقصد کبھی پورا
نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تو اگر بہت آدمی ایک وقت میں فرادیٰ
بھی نماز پڑھیں، ان میں امام اور ماموم والا نظام نہ ہو تب بھی
سمتِ قبلہ کا اتحاد ان میں اجتماعیت کا ضامن ہے۔ ان کا ایک
ہی رُخ کی طرف محوِ عبادت ہونا ہی اس امر کا مظہر ہے کہ وہ
کسی ایک قانون کے ماتحت عبادت انجام دے رہے ہیں اور کوئی

ایک طاقت ہے جو سب پر حکمراں ہے۔

لباس

نماز کے لئے لباس میں بھی کچھ شرائط ہیں۔ حریر محض نہ ہو۔ غیر ماکول اللحم حیوان کے اجزا پر مشتمل نہ ہو۔ میتہ نہ ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان شرائط کا مقصد کیا ہے۔ کیا خداوند کی جانب سے عمدہ اور قیمتی لباس پہننے کی ممانعت ہے اور ہماری آرائش ناپسند ہے اور کیا منظور یہ ہے کہ ہم صفائی اور خوشنمائی سے بالکل الگ رہیں۔

ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق اچھے سا اچھا کپڑا پہننا ہمارے لئے جائز ہے۔ بلکہ نعمتِ خداوندی کے اظہار کے لئے ممدوح و مستحسن ہے۔

انسان کو خدا نے دیا ہو اور پھر وہ پھٹے حالوں رہے۔ اس طرح کہ لوگ اسے مفلوک الحال اور پریشان سمجھیں یہ خدا کی نگاہ میں ناپسند ہے اور کفرانِ نعمت میں داخل ہے۔

امام جعفر صادق فرماتے ہیں ان اللہ عزوجل یحب الجمال والتجمل ویبغض

البوس والتباؤس خداوند عالم خوش نمائی اور آرائش کو پسند کرتا ہے اور بدحالی

اور پریشاں منظری کو ناپسند کرتا ہے۔

دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا ہے اذا انعم اللہ علی عبد بنعمۃ احب

ان یراھا علیہ جب خدا نے بندہ کو نعمت عطا کی ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس

نعمت کا اثر بندہ پر نمایاں ہو۔

رسالتمآب نے ایک شخص کو دیکھا جو پریشان میلے کپڑے پہنے ہوئے بہت

برُے حال میں تھا۔ حضرت نے فرمایا من الدین المتعۃ "دین میں داخل ہے خدا

کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا۔ دوسری حدیث میں حضرت نے فرمایا بئس العبد

القاذورۃ "برا ہے وہ خدا کا بندہ جو میلا رہے"

لباس اگر حیثیت کے مطابق قیمتی پہنا جائے تو اسراف کا کوئی سوال

نہیں ہے۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں۔

ثلثۃ اشیاء لا یحاسب اللہ علیھا المؤمن طعام یاکلہ وثوب یلبسہ و

زوجۃ صالحۃ تعاونہ ویحصن بھا فرجہ۔

"تین باتوں میں خدا بندہ سے حساب نہ کرے گا۔ کھانا اور کپڑا اور نیک بیوی"

بیشک ائمہ معصومینؑ کے زمانہ میں عام خیال تھا کہ پھٹے پرانے کپڑے پہننا

زہد و تقویٰ کی نشانی ہے اور اچھے کپڑے پہننا ورع و تقویٰ کے خلاف ہے

ائمہ معصومینؑ نے اس غلط فہمی کو دور کیا ہے۔ چناں چہ احمد بن محمد

بن ابی نصر کی روایت ہے کہ امام رضاؑ نے ان سے دریافت کیا ما تقول
فی اللباس الحسن "اچھے لباس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے"
یہ ایک انداز ہے تعلیم دینے کا۔ انھوں نے کہا۔ بلغنی ان الحسن کان یلبس
وان جعفر بن محمد کان یاخذ الثوب الجدید فیامر بہ فیغمس فی الماء
"میں کیا اپنا خیال ظاہر کروں مگر میں نے سنا ہے کہ امام حسنؑ اچھا لباس پہنتے
تھے اور امام جعفر صادقؑ نیا کپڑا خریدتے تھے اور اسے پانی میں دھلوا کر صاف
کراتے تھے"۔

امام نے فرمایا:- البس وتجمل فان علی بن الحسین کان یلبس الجبۃ
الخز بخمسمائۃ درھم والمطرف الخز بخمسین دینارا فیشتو فیہ
فاذا خرج الشتاء باعہ فتصدق بثمنہ
ال شوق سے اچھے کپڑے پہنو اور زینت کرو۔ امام زین العابدینؑ پانچسو
درہم کی قیمت کا خز کا جبّہ پہنتے تھے۔ اور چادر خز کی اوڑھتے تھے۔
پچاس دینار کی قیمت کی۔ جاڑا اس میں بسر کرتے تھے اور جب سردی کا زمانہ
گزر جاتا تھا تو اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کو راہِ خدا میں دیتے تھے
پھر حضرت نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:-

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ
مِنَ الرِّزْقِ۔

کہو کس نے حرام کیا ہے خدا کی پیدا کی ہوئی زینت کو جو اس نے بندوں کے لئے قرار دی ہے۔ اور پاکیزہ (یعنی حلال چیزوں کو رزق میں سے"
بلکہ نماز کے موقع پر خاص طور سے یہ ہدایت ہوئی ہے کہ لباس فاخرہ پہن کر مصلّے پر آؤ۔ قرآن مجید میں ہے:-

خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ ۝

اس کا مطلب یہی ہے کہ عبادت کے لئے آراستہ ہو کر آؤ۔

لباس کے ایک درجہ کو تو ضروری و لازمی قرار دیا۔ یہاں تک کہ اگر برہنہ نماز پڑھے تنہائی میں بھی جب کہ کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو نماز باطل ہے۔ بعض درجوں کی اس حد تک تاکید کی کہ بغیر اس کے نماز مکروہ ہے۔ جیسے گھٹنوں سے اونچا لباس۔ یا جسم کے اوپر کا حصّہ کا برہنہ ہونا۔ یا سر کا برہنہ ہونا۔ اس کے بعد بعض درجے استحباب کے قرار دئے جیسے سر پر عمامہ دوش پر ردا کا ہونا۔

لیکن پھر بھی لباس کے معاملہ میں آزاد نہیں رکھا۔ پابندیاں قرار دی ہیں۔ ان پابندیوں کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہماری خوش لباسی اور خوش منظری ناپسند ہے بلکہ ان کا کچھ اور مقصد ہے۔ ممکن ہے ہم پورے طور پر ان مصالح کو نہ سمجھ سکیں۔

مگر ایک مشترک مفاد جو ان تمام پابندیوں میں مضمر ہے وہ یہ کہ انسان

کو اپنے خالص مادی ضروریات کو پورا کرنے میں بھی احساسِ فرائض قائم رہتا ہے اور یادِ الٰہی باقی رہتی ہے۔ دیکھئے عید قریب ہے آپ کو نئے لباس کا شوق ہوا جیب میں روپے لئے اور بزاز کی دکان پر پہنچے۔ اچھے کپڑے کی فرمائش کی۔ اس نے دیدہ زیب خوشنما اور قیمتی کپڑے دکھلانا شروع کئے۔ آپ نے کپڑوں کو دیکھنا اور پسند کرنا شروع کیا۔ یہ سب کچھ مادی خواہش کے پورا کرنے کے لئے ہو رہا ہے۔ لیکن اسی دوران میں ایک ایسا کپڑا سامنے آگیا جس میں شبہ ہے۔ آپ نے بے ساختہ پوچھا یہ خالص ریشم تو نہیں ہے۔ بس معلوم ہوا کہ آپ اس مادی ضرورت کے پورا کرنے میں بھی اپنے خالق سے غافل نہیں ہیں اور آپ کو فرض کا احساس موجود ہے۔

یہ ان پابندیوں کا نتیجہ ہے کہ ان کی وجہ سے ہر ہر زندگی کے شعبہ میں عبودیت و اطاعت کا جذبہ ہم میں بیدار رہتا ہے اور وہ فراموش نہیں ہوتا۔

لباس میں جن جن چیزوں کی ممانعت کی گئی ہے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ میتہ۔ یعنی غیر ذبیحہ کے وہ اجزا جن سے بحالتِ حیات زندگی کا تعلق ہوتا ہے۔ جیسے کھال یا ہڈی۔ اس کا کوئی جزو اگر انسان کے لباس میں ہوگا تو نماز درست نہ ہوگی۔

۲۔ غیر ماکول اللحم یعنی وہ جانور جس کا گوشت شرعاً حلال نہیں ہے،

اس کے تمام اجزا یہاں تک کہ رونگٹے اور بال جن میں زندگی

سرایت نہیں کرتی وہ بھی ممنوع ہیں۔"

ہم پورے طور پران حیوانات کے خصائص ذاتی پر مطلع نہیں۔ اس لئے

اس حکم کے مصالح کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ مگر ان میں سے ایک قسم یعنی

مسوخات کو جو حرام قرار دیا گیا ہے اس سے بہت حد تک ان معاصی اور

بداعمالیوں سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جو ان حیوانات کی صورت

میں مسخ کا باعث ہوئیں۔ مسوخات میں سے ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے

جیسا کہ بعض عوام کرتے ہیں کہ یہ جانور اصل میں انسان تھے اور وہ اس

صورت میں منتقل کر دیے گئے۔ ایسا نہیں ہے یہ جانور تو پہلے سے

نوعی حیثیت سے موجود تھے۔ مگر بعض امتوں کی بداعمالیوں سے

ان کو ان جانوروں کی شکل پر مسخ کیا گیا۔ گویا ان جانوروں کی صورتیں

مظاہرۂ عذاب کی ایک نشانی بن گئیں۔

ان کے مسوخات میں قرار پاکر حرام ہو جانے سے اس عذاب کی یاد

تازہ ہوتی رہتی ہے اور بداعمالیوں کے نتائج بد کا اندازہ ہوتا ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ یہ مسخ صورت کردار کی باطنی شکل کا ایک افشائے

راز ہے۔ انسان کی ظاہری صورت ایک مجازی پردہ ہے جس میں کبھی

انسانیت کا جلوہ ہوتا ہے اور کبھی حیوانیت پرورش پاتی ہے۔

خدا کی طرف سے اگر یہ پردہ ہٹا دیا جائے تو وہ باطن کی حقیقی کیفیت آنکھوں کے سامنے آجائے۔ اس وقت معلوم ہو کہ یہ انسان تھا یا کوئی اور۔ رحمۃ للعالمین کی امت اپنے ظاہری انتساب کی برکت سے اس عذاب سے مستثنیٰ کردی گئی ہے۔ یہاں دنیا میں پردہ دری نہیں کی جاتی۔ ادعائے اسلام کا حجاب پردہ داری کا کام کرتا ہے۔ مگر آخرت میں سب کہ حقیقتیں بے نقاب ہوں گی جس وقت کے لئے کہا گیا ہے۔

کشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید

اس دن بھی انسانیت قائم رہے۔ حشر بھی انسان کا انسان کی صورت پر ہو تو کامیابی کی نشانی ہے۔

انسان کو کوشش کرنا چاہئے کہ ایسے کام کرے کہ اس کی انسانیت قائم رہے انسان کے پردہ میں وہ ایک حیوان نہ بن جائے۔ یہ احساس ہے جو سوخات کی فہرست سے انسان کو پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ خالص ریشم۔ اس کا پہننا مردوں کے لئے ممنوع قرار دیا گیا ہے اور نماز بھی ان کی اس لباس میں باطل ہے۔ عورتوں کے لئے اجازت ہے۔ اور نماز بھی ان کی جائز ہے۔

۴۔ طلائے خالص کی زینت۔ یہ بھی مردوں کے لئے ممنوع ہے عورتوں کو عام اجازت ہے۔

شرع کو یہ منظور نہیں ہے کہ مردوں میں نسائیت پیدا ہو جائے جس طرح مرد اور عورت کو فطرت نے الگ الگ پیدا کیا ہے شریعت بھی ان کو الگ الگ رکھنا چاہتی ہے وہ چاہتی ہے کہ مرد یہ احساس رکھیں کہ ہم مرد ہیں اور عورتیں یہ احساس رکھیں کہ وہ عورت ہیں۔

عورت کی صفت ہے نزاکت۔ اس لئے نازک اور ملائم لباس اس کے لئے مناسب ہے۔ مرد محنت، مشقت، مزدوری کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس کے مناسب لباس ہونا چاہیئے۔

بیشک میدانِ جنگ میں جنگ کے مفاد سے ریشم کے لباس کی بھی اجازت دی گئی ہے۔

مرد اور عورت میں تفرقہ کے قائم رکھنے ہی کے لئے مرد کے مخصوص لباس کو عورت کے لئے اور عورت کے مخصوص لباس کو مرد کے لئے ناجائز قرار دیا ہے یہ امر مختلف ممالک کے عادات اور رسم و رواج کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ آپ کے ملک میں آپ کے رواج کا لحاظ ہوگا۔ مثلاً پائنچہ دار پاجامہ لہنگا، ساری، عورت کا لباس ہے۔ اچکن، ٹوپی، شیروانی، انگرکھا مرد کا لباس ہے اس کا استعمال دوسری صنف کے لئے حرام و ناجائز ہے۔ ہاں مشترک لباس میں جیسے قمیص، کرتا، گھٹنا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اسے دونوں استعمال کر سکتے ہیں۔

مکان

اس کی ضرورت تو عقلی حیثیت سے ہے چونکہ انسان جسم رکھتا ہے اس لئے بہرحال ایک فضا کی ضرورت ہے جس میں وہ رہے وہ اس کا مکان ہوگا۔ یہ ہر حالت میں ضروری ہے نماز بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس باب میں شرع نے کوئی لازمی پابندی نہیں عائد کی ہے بے شک بعض مقامات مکروہ ہیں۔ بعض مستحب اور بعض مساوی الدرجہ۔ مگر ایک بات ایسی ہے جس کا لحاظ مکان میں بھی ضروری ہے۔ لباس میں بھی بلکہ ہر چیز میں جس کا تعلق نماز سے ہے۔ وہ یہ کہ غصبی نہ ہو۔ غصبی کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کی ملکیت جس میں تصرف کے متعلق مالک کی طرف سے نہ اجازت حاصل ہوئی ہو نہ اس کی رضامندی کا اندازہ ہو۔

مکان اور لباس تو پھر بھی نماز سے بلاواسطہ متعلق ہیں اگر اپنے مکان کے کوٹھے پر وضو کریں ہاتھ آگے بڑھا کر اس طرح کہ دوسرے کے حدود ملکیت کی فضا میں پہنچے تو وضو صحیح نہ ہوگا۔

یہ ہے حقوق الناس کی اہمیت کا نتیجہ جو خدا کی نگاہ میں حقوق اللہ سے زیادہ ناقابلِ معافی ہیں۔

نماز کی کیفیت

شرائط حاصل ہو چکے۔ اذان اور اقامت کہی جا چکی۔ اب اصل نماز کی منزل ہے۔

یوں تو نماز کے واجبات انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ مگر ان واجبات کے ادا کرنے میں سکون اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ پھر آداب و قواعد ہیں اگر ان کی مراعات کی جائے تو نماز میں ایک خاص شان پیدا ہو جاتی ہے۔ ائمہ معصومینؑ نے کوشش کی ہے کہ ان کے متبعین نماز کو امتیازی شان سے بجالائیں۔

ملاحظہ ہو حماد بن عیسیٰ کی روایت جو امام کے ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ ایک روز امام جعفر صادقؑ نے مجھ سے فرمایا

تحسن ان تصلی یا حماد ۔ کیوں حماد نماز بھی پڑھنا آتی ہے؟ یاد رکھئے کہ یہ حماد علوم آلِ محمدؐ کے عالم ہیں کوئی اور شخص حماد سے یہ سوال کہاں کر سکتا تھا۔ مگر یہ امامؑ کا سوال تھا۔ حماد کیا کہتے عرض کیا۔ یا سیدی انا احفظ کتاب حریز فی الصلوٰۃ میں حریز کی کتاب جو نماز کے بارے میں ہے اسے حفظ رکھتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا لا علیک قم صلِّ اچھا کوئی حرج نہیں۔ کھڑے ہو نماز پڑھو۔ حماد کہتے ہیں میں امام کے سامنے کھڑا ہوا۔ قبلہ کی

طرف متوجہ ہو کر نماز شروع کی۔ اور رکوع و سجود سب ادا کیا۔

حضرت نے فرمایا:- یا حماد لاتحسن ان تصلی حماد تمہیں نماز پڑھنا نہیں آتی۔ اللہ اکبر! اتنا ہی کافی تھا مگر اس کے بعد ایک تازیانہ لگایا گیا ہے۔ صرف حماد ہی کو نہیں بلکہ تمام شیعیت کے دعویداروں کو ارشاد ہوتا ہے۔ ما اقبح بالرجل منکم ان یاتی علیہ ستون سنۃ اوسبعون سنۃ فما یقیم صلوٰۃ واحدۃ بحدودھا تامۃ تم میں سے کسی ایک شخص کے لئے کتنی بڑی بات ہے کہ ساٹھ یا ستر برس کی عمر ہو جائے اور وہ ایک نماز بھی اس کے حدود و قواعد کے ساتھ مکمل طور پر ٹھیک سے نہ پڑھے۔

حماد کہتے ہیں فاصابنی فی نفسی الذل مجھے اپنے دل میں ایک ذلت سی محسوس ہوئی۔ یعنی میں خود اپنی نگاہ میں حقیر سا معلوم ہونے لگا۔ میں نے عرض کیا جعلت فداک فعلمنی الصلوٰۃ میری جان آپ پر نثار پھر مجھے نماز تعلیم فرمائیے۔

یہ سن کر حضرت کھڑے ہوئے قبلہ کی طرف رخ کر کے سیدھے فارسل یدیہ جمیعا علی فخذیہ قد ضم اصابعہ اپنے دونوں ہاتھ آپ نے دونوں زانوؤں کے اوپر ڈال دیئے اس طرح کہ انگلیاں ہاتھوں کی ملی ہوئی تھیں۔ حماد کو تنبیہ سخت ہو چکی تھی اس لئے امام کے ہر فعل کو بڑے غور سے دیکھا

ہے اور کوشش کی ہے کہ الفاظ کے ذریعہ سے امامؑ کی پوری تصویر دوسروں کے سامنے پیش کر دیں۔ یہ حالت قیام کی تصویر ہے۔ ابھی تکبیرۃ الاحرام نہیں ہوئی ہے، صرف نماز کا تہیہ ہے۔ وفرق بین قدمیہ حتی کان بینھما ثلث اصابع مفرجات دونوں پیروں میں آپ نے فاصلہ قرار دیا۔ اتنا جیسے تین انگلیاں کشادہ۔ واستقبل باصابع رجلیہ لم یحرفھما عن القبلۃ اور پیروں کی سب انگلیوں کو قبلہ رخ کر لیا۔ ذرا بھی ادھر ادھر نہیں تھے بخشوع واستکانۃ اس سب میں فروتنی اور عاجزی کا ایک عالم تھا کہ جو نمایاں تھا فقال اللّٰہ اکبر اب آپ نے تکبیرۃ الاحرام کہی ثم قرأ الحمد بترتیل وقل ھو اللّٰہ احد پھر سورۂ حمد اور قل ھو اللّٰہ بہت روشن طریقہ پر حروف کو نمایاں کر کے تجوید کے ساتھ پڑھا ثم صبر ھنیئۃ بقدر ما یتنفس وھو قائم پھر ذرا سا تامل کیا اتنا کہ جیسے سانس لیتے ہیں اس حالت میں کہ آپ کھڑے ہوئے تھے ثم قال اللّٰہ اکبر وھو قائم پھر اسی کھڑے ہونے کی حالت میں آپ نے اللّٰہ اکبر کہا، یہ نہیں کہ سورہ کے بعد رکوع کے لئے جھک گئے اور اس حالت میں تکبیر زبان پر جاری کی، ثم رکع وملأ کفیہ من رکبتیہ مفرجات پھر آپ نے رکوع کیا۔ اور اپنی ہتھیلیوں کو پر کر لیا اپنے گھٹنوں سے اس حالت میں کہ انگلیاں کشادہ تھیں ورد رکبتیہ الی خلفہ حتی استوی ظھرہ حتی لو صبت علیہ

نطرۃ ماء او دھن لم تزل لاستواء ظہرہ ونصب عنقہ وغمض عینیہ۔ آپ نے رکوع میں اپنے گھٹنوں کو پیچھے کی طرف دبا لیا۔ یہاں تک کہ پشت آپ کی استوار ہوگئی اس حد تک کہ اگر پانی یا تیل کا کوئی قطرہ ڈالا جائے تو وہ اپنی جگہ سے ہٹے نہیں۔ پشت کے استوار ہونے کی وجہ سے۔ اس کے ساتھ آپ نے اپنی گردن کو آگے کی طرف بڑھایا اور آنکھوں کو بند کرلیا۔ ثم سبح ثلثا بترتیل وقال سبحان ربی العظیم وبحمدہ پھر آپ نے ترتیل کے ساتھ تسبیح پڑھی سبحان ربی العظیم وبحمدہ تین مرتبہ ثم استوی قائما پھر سیدھے کھڑے ہوگئے فلما استمکن من القیام قال سمع اللہ لمن حمدہ جب اطمینان کے ساتھ قیام ہوگیا تو کہا سمع اللہ لمن حمدہ ثم کبر وھو قائم ورفع یدیہ حیال وجھہ پھر تکبیر کہی، کھڑے ہی کھڑے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کے مقابل میں بلند کئے۔ وسجد ووضع یدیہ علی الارض قبل رکبتیہ وقال سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ ثلث مرات پھر سجدہ کیا اور اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں کے پہلے زمین پر رکھے (یہ ایک نقطۂ اختلاف ہے ہمارے اور اہلسنت کے درمیان۔ وہ گھٹنوں کو زمین پر پہلے ٹیکتے ہیں۔ پھر ہاتھ زمین پر رکھتے ہیں) سجدہ میں آپ نے تین مرتبہ سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ کہا ولم یضع شیئا من بدنہ علی شئی منہ۔ آپ نے

سجدہ میں کوئی جزو اپنے جسم کا دوسرے جزو پر نہیں رکھا۔
یہ سجدہ کی مقررہ صورت کی خصوصیت ہے کہ اس میں کسی حصہ جسم
کا بار دوسرے حصہ پر نہیں پڑتا۔ وسجد علی ثمانیة اعظم الجبھة
والیدین والرکبتین وانامل ابھامی الرجلین والانف
فھذہ السبعة فرض ووضع الانف علی الارض سنة
وھو الارغام۔
آپ نے جسم کی ہڈیوں کو زمین پر رکھ کے سجدہ کیا۔ پیشانی اور دونوں
ہاتھ اور دونوں گھٹنے اور پیروں کے دونوں انگوٹھے اور ناک وہ ساتوں
جزو واجب ہیں اور ناک کا زمین پر رکھنا سنت ہے جس کا نام ہے ارغام
ثم رفع راسہ من السجود فلما استوی جالسا قال اللہ اکبر
پھر آپ نے سجدے سے سر اٹھایا جب اچھی طرح بیٹھ گئے تو کہا اللہ اکبر ثم جلس علی الایسر ووضع ظاہر
قدمہ الیمنی علی باطن قدمہ الیسری وقال استغفر اللہ ربی واتوب الیہ۔
اللہ اکبر کہنے کے بعد اس طرح بیٹھے کہ بائیں پہلو پر زور دیا۔ اور داہنے
پاؤں کی پشت کو بائیں پاؤں کے تلوے پر رکھا اور استغفر اللہ ربی
واتوب الیہ زبان پر جاری کیا ثم کبر وھو جالس وسجد الثانیة
وقال کما قال فی الاولی پھر بیٹھے ہونے کی حالت میں تکبیر کہی اور دوسرا
سجدہ کیا۔ اور جو پہلے سجدے میں کہا تھا وہی اس سجدہ میں بھی کہا۔

ولم یستعن بشئ من بدنه علی شئ منہ فی رکوع ولا سجود وکان بجتحا ولم یضع ذراعیہ علی الارض آپ نے کسی حصۂ جسم کیلئے دوسرے حصۂ جسم کا سہارا نہیں لیا نہ رکوع میں اور نہ سجدہ میں اور آپ نے ہاتھوں کو اس طرح رکھا تھا جیسے طائر کے بازو ہوتے ہیں۔ اور اپنے ہاتھوں کو سجدہ میں زمین پر نہیں رکھا (جیسے سجدۂ شکر میں ہوتا ہے) فصلی رکعتین علی ھٰذا۔ اسی طرح آپ نے دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر فرمایا یا حماد ھٰکذا اصل ولا تلتفت ولا تعبث بیدیک واصابعک

اے حماد اس طرح نماز پڑھا کرو اور نماز میں ادھر ادھر دیکھو نہیں۔ اور ہاتھوں اور انگلیوں کو بے کار جنبش نہ دو۔

یہ تھی وہ صورت نماز جو حماد کو بتلائی گئی تھی۔ یاد رکھئے کہ اس سے بھی صرف نماز کی ظاہری صورت مکمل ہوتی ہے مگر روح نماز اس کے علاوہ ہے۔ کوئی شخص اگر بالکل اسی صورت سے مکمل طور پر نماز پڑھے مگر للّٰہیت کا جذبہ نہ موجود ہو اور خالق کی اطاعت کا خیال نہ پایا جاتا ہو۔ بلکہ لوگوں کو دکھانے کا مقصد پیش نظر ہو تو وہ نماز ذرا بھی قیمت نہیں رکھتی اور بارگاہِ الٰہی میں قبول ہونے کے قابل نہیں ہے۔

روح نماز میں پیدا ہوتی ہے۔ عبادت کی اہمیت کے احساس سے اور بارگاہِ الٰہی کی عظمت کے تصور اور رجوعِ قلب سے جس کا نتیجہ ہے

حقیقی خضوع و خشوع جو دل سے متعلق ہے۔ ائمہ معصومینؑ نے اس احساس کو بھی بیدار کرنا چاہا ہے۔ مختلف طریقوں سے کبھی یہ ارشاد فرمایا اذا قمت الی الصلوٰۃ فاعلم انک بین یدی اللہ فان کنت لا تراہ فاعلم انہ یراک "جب نماز کے لئے کھڑے ہو تو یقین رکھو کہ تم خدا کے سامنے ہو۔ تم اسے نہیں دیکھتے ہو تو یقین جانو کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے"

اگر عمل کے وقت یہ احساس قائم رہے کہ وہ خدا کے سامنے ہے اور یہ کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے تو کیا ممکن ہے کہ اس کے دل میں ادھر ادھر کے خیالات پیدا ہوں اور نظر ادھر اُدھر مڑ جائے"

جتنے گناہ انسان کرتا ہے صرف اس لئے کہ وہ اس کا تصوّر قائم نہیں رکھتا کہ خدا حاضر و ناظر ہے اور یہ کہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔

اگر یہ احساس قائم رہے تو ناممکن ہے کہ انسان گناہ میں مبتلا ہو یا عبادت کو بے دلی کے ساتھ انجام دے۔

ایک جگہ ارشاد ہوا ہے اذا صلیت فصلّ صلوٰۃ مودّع یخاف ان لا یعود الیھا "جب نماز پڑھو تو یہ خیال کرتے کہ یہ آخری نماز ہے کہ ممکن ہے اس کے بعد پڑھنا نصیب ہو"

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں کسے معلوم کہ جو نفس آ رہا ہے وہی آخری نہیں ہے چہ جائیکہ دوسری نماز تک زندہ رہنے

کا اطمینان ہو۔ اگر یہ خیال نماز کے وقت پیدا ہو جائے تو یقیناً نماز اس طرح ادا ہوگی جس طرح انسان کو پڑھنا چاہیئے۔

ائمہ معصومینؑ

اور

شیعانِ اہلبیت کی نماز

جس طرح اقوال سے ائمہ معصومینؑ نے لوگوں کو نماز میں خضوع و خشوع پیدا کرنے کی ہدایت فرمائی اسی طرح اپنے عمل سے ایسے ہی نمونے پیش کئے اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ ان کا نصب العین دنیا کو علم و عمل میں کمال درجہ پر پہنچانا تھا لہٰذا خود انہیں ہر شعبۂ زندگی میں حدِ کمال پر ہونا ضروری تھا چنانچہ امام زین العابدینؑ کی یہ کیفیت تھی کہ اذا قام الی الصلواۃ تغیر لونہ فاذا سجد لم یرفع راسہ حتی یرفض عرقا "جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو آپ کا رنگ چہرے کا متغیر ہو جاتا تھا اور جب سجدہ کرتے تھے تو سر نہیں اٹھاتے تھے جب تک پسینہ میں تر نہیں ہو جاتے تھے"۔ چونکہ حالتِ نماز میں سب سے بلند موقع سجدہ کا ہے۔ اس لئے ائمہ معصومینؑ سب سے زیادہ طول سجدہ میں دیتے تھے۔

ایک روایت میں ہے کان علی بن الحسین اذا قام الی الصلوٰۃ کانہ ساق شجرۃ لا یتحرک منہ شیئ " امام زین العابدینؑ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک درخت کا تنہ ہے جو سوائے ہوا کی جنبش کے ذرا بھی حرکت نہیں کرتا۔

ابان بن تغلب کہتے ہیں انی رایت علی بن الحسین اذا قام الی الصلوٰۃ غشی لونہ لون اخر" میں نے امام زین العابدینؑ کو دیکھا کہ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو آپ کے اصلی رنگ پر دوسرا رنگ غالب آجاتا تھا"

امام جعفر صادقؑ نے اس کا سبب بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ واللہ ان علی بن الحسین کان یعرف الذی یقوم بین یدیہ

" امام زین العابدینؑ جانتے تھے کہ وہ کس کے سامنے کھڑے ہو رہے ہیں"

ابو حمزہ ثمالی کا بیان ہے رأیت علی بن الحسین یصلّی فسقط رداوٗہ عن منکبہ فلم یسوہ حتی فرغ من صلوٰتہ نسألتہ عن ذالک فقال ویحک اتدری بین یدی من کنت

"میں نے امام زین العابدینؑ کو دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور اس حالت میں آپ کی چادر آپ کے شانہ پر سے گر گئی۔ آپ نے اس کو درست نہیں کیا یہاں تک کہ اپنی نماز کو ختم کیا۔ میں نے اس کے متعلق دریافت کیا۔ تو فرمایا کہ تم جانتے ہو میں کس کے سامنے تھا؟"

امام حسنؑ کے متعلق بھی وارد ہوا ہے کہ جب آپ وضو سے فارغ ہوتے تھے تو چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا۔ حق

علیٰ من اراد ان یدخل علیٰ ذی العرش ان یتغیر لونہ

جو شخص عرش کے مالک کی بارگاہ میں حاضر ہو اس کا رنگ متغیر ہو ہی جانا چاہیئے۔

نیز جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو ہاتھ پیروں میں لرزہ ہوتا تھا: ائمہ معصومینؑ کی اس قولی و عملی ہدایت ہی کا اثر تھا کہ اس زمانہ میں نماز میں خضوع و خشوع شیعیانِ اہلبیت کا خاص طرۂ امتیاز تھا۔

اس کی ایک سند تاریخی میرے پیش نظر ہے جو ایک دشمن اہلبیت کی زبانی ہے اور جس کو قدیم مورخ ابو حنیفہ دینوری نے اپنی کتاب اخبار طوال میں درج کیا ہے۔

اس موقع پر جب حضرت مسلم بن عقیل امام حسینؑ کی طرف سے نمائندہ ہو کر کوفہ آئے ہیں اور آپ نے مخفی طور پر امام حسینؑ کے ساتھ اہل کوفہ سے وفاداری کا عہد لینا شروع کیا۔ اور ابن زیاد حاکم ہو کر کوفہ آیا تو اس نے حضرت مسلم کی سراغ رسی شروع کی اور اپنے ایک غلام معقل کو جو اہل شام میں سے تھا اس کام کے لئے معین کیا اسے ایک تھیلی میں تین ہزار درہم دئیے اور کہا مسلم کا پتہ لگاؤ۔ معقل گیا اور سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح جناب مسلم کا

پتہ چلائے۔ اسی فکر میں وہ مسجد اعظم میں آیا۔ اور اس نے دیکھا کہ مسجد کے ایک ستون کے پاس ایک بزرگ نماز میں مشغول ہیں اور بہت سی نمازیں انہوں نے پڑھی ہیں۔ تاریخ کے الفاظ ہیں۔ فقال فی نفسہ ان ہولاء الشیعۃ یکثرون الصلواۃ واحسب ھذا منھم

اس شخص نے اپنے دل میں کہا کہ یہ شیعہ لوگ نماز بہت پڑھتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ شخص ان ہی میں سے ہے" اسی خیال پر وہ آگے بڑھا اور اس نے سراغ رسانی میں کامیابی حاصل کی۔ یہ بزرگ مسلم بن عوسجہ تھے جو حضرت مسلم بن عقیل کی جانب سے لوگوں سے بیعت لیتے تھے۔

آپ نے دیکھا کہ کثرت نماز و عبادت اس زمانہ میں شیعہ فرقہ کی علامت تھی۔ افسوس ہے کہ آج ہمارے فرقہ کے بہت سے افراد نماز سے بے توجہی برتتے ہیں اور اسے اہمیت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

تکبیرات استفتاح

نماز سے پہلے سات تکبیریں کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک تکبیرۃ الاحرام ہو گی۔ اور چھ تکبیریں مستحب۔ یہ اسی لئے کہ کسی ایک تکبیر میں شاید دل پر اثر پڑ جائے۔ اور نماز رجوع قلب کے ساتھ ہو جائے اسی لئے درمیان میں ایسی دعائیں قرار دی گئی ہیں کہ جن سے انسان متاثر ہو سکتا ہے۔

نماز شروع کرنا چاہے تو ہاتھوں کو بلند کرے اور تین مرتبہ تکبیر کہے پھر یہ دعا پڑھے:۔

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْمَلِکُ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ ذَنْبِیْ اِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ۔

ان مختصر الفاظ میں تحمید و توحید ہے اور اس کے ساتھ تسبیح پھر اعتراف گناہ ہے اور توبہ و استغفار ہے۔ وہ اپنے ہی بارگاہ کے دروازے پر اور کہتا ہے: خداوندا تو ہے بادشاہ " انسان کی ذہنیت یہ ہے کہ وہ اقتدار سے مرعوب ہوتا ہے مگر ہر اقتدار سے بالاتر خدا کا اقتدار ہے۔ اس لئے اس کے اقتدار کو یاد کر کے انسان عظمت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ پھر خیال کرتا ہے کہ دنیا میں بادشاہ تو بہت ہیں پھر خالق کی خصوصیت کیا ہوئی تو کہتا ہے۔ "الحق" یعنی دوسرے اگر بادشاہ ہیں تو مجازی حیثیت سے۔ حقیقی بادشاہ صرف تو ہے "المبین" یعنی تیری سلطنت کے لئے کسی ثبوت کی تلاش کی ضرورت نہیں اس کے آثار روشن اور نمایاں ہیں۔ اس سلطنت و اقتدار کیساتھ احساس ہوتا ہے کہ پھر انتہائی تعظیم کا لائق اور پرستش کا مستحق بھی وہی ہے اس لئے کہتا ہے لا الہ الا انت کوئی معبود حق نہیں سوائے تیرے۔ اس طرح تحمید کے بعد توحید کی منزل طے ہوئی ہے۔ "سبحانک" پاک ہے تیری ذات" اس میں نقائص کی اس کی ذات سے نفی کی اور

اس کی ذات کے پاک اور منزّہ ہونے کا اظہار کیا۔ اس طرح اپنے خالق کے ہمہ تن کمال ہونے کا اقرار کرنا تھا کہ اپنے نقائص پر نظر گئی اور کوتاہیوں کا احساس ہوا۔ فوراً کہہ اٹھا۔ "اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ" بار الٰہا، میں نے اپنے نفس پر بڑا ستم کیا یعنی گناہوں کا ارتکاب کرتا رہا۔ کیونکہ اصطلاح قرآنی میں گناہوں کے مرتکب کو ظالم کا لقب دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَنْ یَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ "جو لوگ خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہی ظالم ہیں۔" گناہ کے احساس کے بعد انسان ادھر اُدھر نظر ڈالتا ہے کوئی سہارا سوائے خدا کے نظر نہیں آتا فَاغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ اِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ خداوندا اب میرے گناہ کو بخش دے۔ یقیناً سوائے تیرے کوئی نہیں جو گناہوں کو معاف کر سکے۔"

اس کے بعد پھر دو مرتبہ تکبیر کہے پھر کہے لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ وَالْخَیْرُ فِیْ یَدَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ وَالْمَهْدِیُّ مَنْ هَدَیْتَ لَا مَلْجَا مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ سُبْحَانَکَ وَحَنَانَیْکَ تَبَارَکْتَ وَتَعَالَیْتَ سُبْحَانَکَ رَبَّ الْبَیْتِ۔

یعنی حاضر ہوں" یہ لبیک کی صدا کسی مخفی دعوت کا پتہ دے رہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک پہلی دعائیں گناہوں سے استغفار کیلئے

اس وقت تو بندہ اس قابل ہی نہ تھا۔ کہ بارگاہِ الٰہی میں اس کو حاضری کی اجازت ملے۔ مگر جب اس نے گناہوں کا اقرار کر لیا اور توبہ کر لی۔ یاد رکھئے کہ خدا کا دربار دنیا کے سلاطین و امراء کا دربار نہیں جہاں درخواست کی منظوری کے لئے مدتوں کی ضرورت ہو بلکہ یہ وہ بارگاہ ہے جہاں صدق دل سے توبہ کا خیال آنے کے ساتھ ہی گناہ کی معافی کا پروانہ مل جاتا ہے پہلے تکبیرات کے بعد بھی جب خدا کی حمد و ثنا کے بعد یہ کہا کہ میں مجرم ہوں۔ خداوندا میرے گناہ کو معاف کر دے۔ تیرے سوا کون ہے جو مجھے معافی کا پروانہ دے سکے۔ اگر یہ الفاظ صحیح احساس و اقرار کے ساتھ کہے گئے ہوں تو یہی عفوِ گناہ کے لئے کافی ہیں۔ اب گویا یہ بندہ اس قابل ہوا کہ بارگاہ صمدی میں اس کو حاضر ہونے کے لئے آواز دی جائے۔ غیب کی آواز اس کے دل کے کانوں میں آتی ہے اور یہ کہتا ہے "لبیک" حاضر ہوں۔" اور میری خوش قسمتی تیری توجہ کے ساتھ وابستہ ہے؛" اور بہتری تیرے قبضہ میں ہے۔ اور برائی کا تیری طرف گذر نہیں اور ہدایت یافتہ وہی ہے جس کی تو ہدایت کرے؛

مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ زندگی میں میرا صحیح راستے پر قائم رہنا تیری ہی ہدایت پر موقوف ہے" تجھ سے بھاگنے کی کوئی جگہ

نہیں سوائے تیرے" یعنی انسان تجھ سے بھاگ کر جائے تو کہیں اس کا ٹھکانا نہیں ہر پھر کے اسے تیری ہی طرف آنا پڑے گا" پاک ہے تیری ذات اور مہربان ہے تو، بابرکت ہے اور تیری ذات بلند ہے، تو ضرور نقائص سے پاک اور بری ہے، اے خانۂ کعبہ کے پروردگار"

اب گویا بندہ بارگاہ احدیت میں حاضر ہو گیا۔ اور جلال حضرت احدیت اس کے چہرہ کے سامنے آگیا وہ دو مرتبہ اور تکبیر کہتا ہے اور عرض کرتا ہے وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔

رُخ کیا میں نے اس کی طرف جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور وہ واقف ہے غیب کی باتوں کا، میں اس کے لئے خلوص کے سر جھکاتا ہوں اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا۔ میری نماز اور میری عبادت اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور اسی کا مجھے حکم ہوا ہے اور میں سر نیاز خم کئے ہوئے اس کی بارگاہ میں!

یہ ہیں وہ الفاظ جن سے نماز کا افتتاح ہوتا ہے۔ سچ بتایئے کہ

اگر ان کلمات کا انسان کے دل پر اثر پڑ جائے تو کیا ممکن بھی ہے کہ نماز میں انسان کو رجوع قلب نہ ہو یا وہ اِدھر اُدھر کے خیالات سے اپنے دماغ کو پریشان رکھے۔

انسان کو اختیار ہے کہ ان ہی تکبیرات میں جس کو چاہے بقصد تکبیرۃ الاحرام کہے۔ اس دعائے توبہ (وجہت وجھی) کے بعد اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ کے ساتھ سورۂ حمد شروع کرے جو نماز میں فرض و لازم ہے اس کے علاوہ سوائے تکبیرۃ الاحرام کے تمام تکبیرات اور دعائیں مستحب ہیں ان کا پڑھنا واجب نہیں ہے۔

سورۂ حمد

نماز میں سورۂ حمد کو بڑی اہمیت حاصل ہے ارشاد ہوا ہے لَا صَلوٰۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ یہاں تک کہ نوافل میں دوسرا سورہ ترک اگرچہ جائز ہے مگر سورۂ حمد ان میں بھی ضروری ہے۔ اور واجبی نماز میں دوسرے سورہ میں کوئی تعیین نہیں مگر سورۂ حمد معین طور پر لازم ہے۔ یعنی کوئی دوسرا سورہ اس کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر سورۂ حمد کے اسماء میں بعض علماء نے سورۃ الصلوٰۃ بھی نام درج کیا ہے۔

سورۂ حمد کے متعلق امیرالمومنین کا یہ قول مشہور ہے کہ جو کچھ تمام

قرآن میں ہے وہ سورۂ حمد میں ہے اس کی حقیقت و تشریح کو تو پورے طور پر ہم نہیں سمجھ سکتے مگر ہم اپنی عقل کے مطابق بھی غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام قرآن کا مقصد اصلی دو باتیں ہیں۔ اعتقاد اور عمل۔ اعتقاد کے دو شعبے ہیں مبدا اور معاد۔ اور عمل کے دو شعبے ہیں۔ اچھے اوصاف سے اتصاف اور برے اوصاف سے اجتناب۔

سورۂ حمد ترتیب وار ان تمام امور پر مشتمل ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مبداء اوّل یعنی حضرت احدیت کا اعتقاد مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ روزِ آخرت اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اچھے اعمال سے اتصاف اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ برے اعمال سے اجتناب۔

معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ حمد ایک متن ہے اور تمام قرآن اس کی شرح وہ اصل ہے اور مجموعۂ کلام مجید اس کی تفصیل۔

سورۂ حمد میں بھی اہم ترین آیت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہے۔ اس کے متعلق امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے کہ جو کچھ تمام سورۂ حمد میں ہے وہ تنہا بسم اللہ میں ہے۔

آپ ان چاروں شعبوں پر غور کیجیے جن کا پتہ ہمیں نے سورۂ حمد سے دیا ہے

تو معلوم ہوگا کہ ان سب کا خلاصہ ہے۔ عبد و معبود کا باہمی تعلق کہ خالق بے نیاز اور مرکزِ فیض ہے اور مخلوق محتاج اور اس کے فیض کا طالب ہے خالق اور مخلوق کے اس تعلق کو بسم اللہ الرحمن الرحیم بتلاتا ہے جس میں بندہ اپنے خالق کے فیض و رحمت کا پتہ دیتا ہوا اس سے امداد کا طالب ہوتا ہے۔

غالباً اسی اہمیت کا تقاضا ہے کہ سورۂ حمد میں اس آیت کے لئے خصوصیت سے بلند آواز سے پڑھنے کا حکم ہے۔ چاہے نماز ظہر یا عصر کی ہو جس میں سورہ کو آہستہ پڑھنا لازم ہے۔

اب ذرا سورۂ حمد کے معانی پر نظر ڈالیئے تفصیل کا یہ موقع نہیں اس کے لئے ہماری کتاب تفسیر کا مطالعہ فرمایئے جس کی ایک جلد مستقل سورۂ حمد کی تشریح میں لکھی گئی ہے۔

انسان آتا ہے مصلے پر اور نیت نماز کرتا ہے جس میں عمل کو اپنی طرف منسوب کر کے اس کے بجالانے کے مقصد کا اظہار ہے۔ اس میں گنجائش نکلتی ہے کسی حد تک عجب و خود بینی کی۔ اس لئے بلند آواز سے کہتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم "مدد سے اللہ کی جو بڑی رحمت والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے"۔ مطلب اس کا محل کے تقاضا سے یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ میں عمل بجالانا چاہتا ہوں اس کے لئے ارادہ تو میرا ہے مگر تکمیل اس کی اللہ کی

کی مدد پر موقوف ہے۔ الحمد للہ رب العالمین "تعریف مخصوص ہے اللہ کے لئے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے" اسے ایک سپاسنامہ سمجھئے جو بندہ اپنے مالک کے دربار میں حاضری کے بعد پیش کر رہا ہے الرحمن الرحیم جو بڑی رحمت والا ہے اور بہت رحم کرنیوالا ہے اس کا تذکرہ بسم اللہ میں بھی ہو چکا تھا۔ مگر وہاں امداد طلب کرنے کے ذیل میں تھا۔ اور یہاں استحقاق حمد کے ثبوت میں۔ محل بدلا ہوا ہے اور مفاد جدا گانہ اس لئے تکرار لازم نہیں آتی۔ مالک یوم الدین " وہ جو روز جزا کا مالک ہے" اس کے پہلے ربوبیت کا تذکرہ تھا جس کے نمایاں آثار اس دنیا میں سامنے ہیں۔ اب نظر آگے بڑھی اور اقرار ہوا کہ دنیا میں نہیں بلکہ آخرت پر بھی قبضہ اسی کا ہے۔ اس لئے بندہ کی حاجتیں وہاں کے لئے بھی اس سے وابستہ ہیں۔ الوہیت انسان کی ہستی سے پہلے ہے۔ ربوبیت انسان کے دورِ ہستی میں ظاہر ہے جو اس کی بقا و تکمیل کی باعث ہے اور یوم الدین کی مملکت آئندہ دور سے متعلق ہے۔ اس طرح ان مختصر الفاظ میں انسان کی نگاہ ماضی، حال اور مستقبل سب کے اوپر پہنچ گئی۔ اور خالق کی عظمت کا ایک نقشہ سامنے کھنچ گیا۔ جس کی وجہ سے اس کے پہلے اگر وہ اس کی نگاہ سے اوجھل تھا۔ اس لئے بہ غائبانہ انداز سے تخاطب کر رہا تھا۔ تو اب پردہ ہٹ گیا۔ اور اس کا جلال بالکل آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اس لئے اندازِ کلام بدلا۔ تخاطب، کا انداز پیدا ہوا۔

ایاک نعبد وایاک نستعین تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد کے طالب ہیں۔"

دوسرا مقام ہوتا تو "ہم" کی لفظ کے تخاطب میں عظمت کی شان پیدا ہوتی تھی۔ مگر بندے کی بارگاہ میں اپنی خدمت کے پیش کرنے کے موقع پر "میں" کی لفظ انانیت کا اظہار کرتی ہے۔ کہا جارہا ہے کہ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں" یعنی یہ خود اپنی ہستی کو انفرادی اس کے خدمات کو قابل تذکرہ ہی نہیں سمجھتا۔ بلکہ اپنے تئیں تمام بندگان خدا میں شامل کرکے بارگاہ الہی میں عرض معروض کرتا ہے۔ پھر عبادت کو اپنی طرف منسوب کرلینے سے اپنے نفس پر اعتماد کا اظہار ہوتا تھا۔ اس لئے کہہ دیا وایاک نستعین یعنی ہم کیا جو تیری عبادت کرسکیں۔ ہم اپنے مقدور بھر عبادت کرتے ہیں اور پھر مدد کے تجھ ہی سے امیدوار ہیں۔

چونکہ خدا کی مدد انسان کے عمل پر موقوف ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ "جو ہمارے راستوں میں جدوجہد کرتے ہیں ہم انہیں منزل تک پہنچا بھی دیتے ہیں"۔ اس لئے پہلے ایاک نعبد کہا گیا ہے پھر وایاک نستعین کیونکہ اگر اس کی جانب سے عبادت کی پیش قدمی نہ ہو تو اسے امداد حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ پھر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ امداد کسی حاجت دنیا کے سلسلہ میں نہیں ہے۔

نظام زندگی

اس کی تشریح کر دی۔ اھدنا الصراط المستقیم وہ اعلان یہ ہے کہ ہم کو سیدھے راستے کی ہدایت فرما۔" وہ سیدھا راستہ کون سا ؟

صراط الذین انعمت علیھم ان لوگوں کا راستہ جن کو تو نے اپنی نعمت سے مالا مال کیا ہے۔

یہ لوگ کون ہیں۔ اس کی تشریح قرآن مجید میں ایک اور جگہ کر دی گئی ہے۔ اس طرح کہ :-

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا.

معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ وہ ہیں جن پر خدا کی طرف سے انعام ہوا ہے مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھ کو انبیاء و صدیقین، شہدا اور صالحین کے راستے پر لے چل۔ یعنی ان کے سے اعمال بجا لانے کی توفیق دے۔

ضد سے ضد کی طرف نگاہ کا مڑنا لازمی بات ہے

ان نیکو کار لوگوں کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ہی برے اعمال کے مرتکب لوگوں کی طرف نگاہ گئی اور ان سے نفرت پیدا ہوئی۔ بندہ نے ان سے برائت کرنا چاہی اور پناہ مانگی کہ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ان لوگوں کے راستے کی طرف نہیں جن پر تیرا غضب نازل ہوا ہے اور نہ وہ جو گمراہ ہیں۔

انسان کو چاہیئے کہ سورہ کے ان الفاظ کو بطور تلاوت زبان پر جاری کرتا رہے اور دل میں اس کے یہی احساسات پیدا ہوتے رہیں۔ اس سے اعمالِ خیر کی طرف رجحان اور برُے اعمال سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو گا۔ اور مقصدِ عبادت کی تکمیل ہو گی۔

دوسرا سورہ

سورۂ حمد کے بعد کوئی دوسرا سورہ پڑھنا چاہیئے۔ اس کے لئے کوئی تعیین نہیں ہے پھر بھی سورہ حمد کے بعد تمام سوروں میں افضل سورۂ قل ہو اللہ ہے۔ لیکن پہلی رکعت میں اِنّا انزلناہ پڑھنے کی بھی ہدایت ہوئی ہے۔ اس لئے ہم مختصر طور پر انا انزلناہ پھر قل ھو اللہ کے معانی درج کرتے ہیں کہ نماز میں ان کا پڑھنا خاص طور پر وارد ہوا ہے

سورۂ اِنّا انزلناہ

یہ سورہ خاص طور پر جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے کیوں کہ آپ کی تسلّی کے لئے نازل ہوا ہے۔

اِنَّا اَنزَلنَاہُ فِی لَیلَۃِ القَدرِ ہم نے اس قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا۔ شبِ قدر کے معنی خداوندی قرارداد کی رات۔

احادیث ائمہ میں وارد ہوا ہے۔ کہ اس رات کو تمام سال کے ہونے والے امور کی تقدیر و تعیین ہوتی ہے۔ وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ تقدیریں تمام ازل میں یقینی طور پر ہو چکی ہیں۔ اور اب کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے لئے شب قدر کا کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ مگر ہم کہ جو خداوندی تقادیر کو اسباب اور حالات پر مبنی سمجھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ خداوند عالم اب بھی نظام عالم سے بے تعلق اور معطل نہیں ہے بلکہ یَمْحُو اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ یہی وہ خیال ہے جس کو بداء کے عقیدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک لیلۃ القدر کا یہ مفہوم قرار پاتا ہے کہ ان حتمی تقادیر کے ماتحت جو عمومی اسباب کی بنا پر ہمیشہ سے مقرر ہیں۔ خاص وقتی حالات کے لحاظ سے ہر سال کے واسطے جو قرار دادیں ہونا ہیں وہ شب قدر میں مقرر ہوتی ہیں۔ اس شب میں تنزیل قرآن کے معنی بھی قابل بحث ہیں جب کہ وہ تیس برس کی طولانی مدت میں تدریجاً اترا ہے۔ اس کے متعلق میں نے مقدمہ تفسیر[1] میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قرآن جیسا کہ احادیث سے مستنبط ہوتا ہے پہلے بیت المعمور میں نازل ہوا تھا پھر وہاں سے تدریجی طور سے رسولؐ پر اترا ہے۔ یہ تاریخ اسی تنزیل اوّل سے متعلق ہے

[1] البیان (لاہور) پاکستان سے صرف ساڑھے چار روپے میں طلب فرما سکتے ہیں۔

جو ملاءِ اعلیٰ میں ہوا تھا۔

مَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ

اور کیا خبر تمہیں کہ شبِ قدر کیا چیز ہے؟ یہ استفہام اظہارِ عظمت کا ایک انداز ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کی فضیلت تمہارے حدِ ادراک سے بالاتر ہے۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ

شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے اس کی شانِ نزول کے متعلق دو روائتیں ہیں ایک یہ کہ رسالت مآبؐ کو علم ہوا کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص ہزار مہینے تک تلوار دوش پر رکھے مصروفِ جہاد رہا۔ آپ کو افسوس ہوا کہ میری امت کی عمریں اتنی کوتاہ ہیں کہ وہ اس نعمت سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔ یہ آیت اتری جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری امت کے لیے ایک اس رات کے اعمال ان تمام ہزار مہینوں سے بہتر ہیں جن میں اس اسرائیلی نے راہِ خدا میں جہاد کیا تھا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے خواب میں دیکھا کہ بنی امیہ آپ کے منبر پر بندروں کی طرح اچھل کود رہے ہیں۔ آپ کو اس کا بڑا غم ہوا۔ اس بناء پر یہ سورہ نازل ہوا۔ ہزار مہینہ سے مراد سلطنت بنی امیہ کی تمام مدت ہے مطلب یہ ہے کہ اے رسولؐ اس کا غم نہ کرو کہ بنی امیہ تمہاری شریعت

کو تباہ و برباد کریں گے۔ کیونکہ جو تمہاری تعلیم پہ قائم رہیں گے اور مومنین مخلصین ہوں گے ان کے لئے ایک رات شب قدر۔ ان تمام ہزار مہینوں سے بہتر ہے جن میں بنی امیہ سلطنت کریں گے۔ اسی شانِ نزول کے مطابق سمجھ میں آتا ہے کہ شب قدر کو زیارت امام حسینؑ کیوں وارد ہے۔ چونکہ یہ شب بنی امیہ کے مظالم کے مقابلہ میں رسولؐ کی تسلّی کا باعث ہوئی۔ اس لئے اس رات میں اہلِ ایمان کو وہ سب سے بڑا ظلم یاد دلایا جاتا ہے جس کے بنی امیہ مرتکب ہوئے تھے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ

"اترتے ہیں فرشتے اور روح اس رات میں اپنے خدا کے حکم سے۔"

قرآن نے اتنا ہی بتلایا ہے کہ اس رات کو برابر فرشتے آسمان سے اترتے ہیں مگر کہاں آتے ہیں اس کی کوئی تصریح نہیں۔

احادیث میں وارد ہوا ہے کہ یہ امامؑ زمانہ کے پاس آتے ہیں۔

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ سَلٰمٌ

"یہ رات ہر بات سے سلامتی کا ذریعہ ہے۔"

هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ

"وہ رات اپنے تمام برکات سمیت صبح صادق کے طلوع تک باقی رہتی ہے۔"

چونکہ عام طور سے طلوع آفتاب تک رات کی حد سمجھی جاتی ہے مگر شرع کی اصطلاح میں رات کی حد صبح صادق پر ختم ہو جاتی ہے اس لئے شب قدر کی بھی آخری حد صبح صادق ہی ہے طلوع آفتاب نہیں ہے۔

سورۂ قُل ہو اللہ

سورۂ حمد کے بعد تمام سورتوں میں بلند درجہ سورۂ توحید کا ہے اس کو ثلث القرآن کہا گیا ہے۔ ممکن ہے اس کی یہ وجہ ہو کہ اصول اسلام تین ہیں توحید، نبوت۔ اور معاد۔ ہم جو اصولِ دین میں عدل اور امامت کا بھی شمار کرتے ہیں وہ اس بناء پر کہ عدل توحید کا ایک جزو ہے۔ اور امامت نبوت کا ایک خاص ضمیمہ الگ سے اس کا نام دے لیتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ لوگوں نے اس کا انکار ضروری سمجھا ہے۔ مگر حقیقتاً توحید مکمل نہیں جب تک عدل کا اقرار نہ ہو۔ اور رسالت کی تصدیق پوری نہیں جب تک امامت تسلیم نہ ہو۔

دیکھئے تو توحید کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا کے صرف وجود کا اقرار ہو کیونکہ یہ تو کسی حد تک تمام مذاہب عالم کا نقطۂ اتفاق ہے۔ عیسائی تین میں کا ایک کہہ کے بھی اس کے وجود کا اقرار رکھتے ہیں اور مشرکین صنم پرستی کے ساتھ بھی اس کی ہستی کے منکر نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ توحید کے اندر

اس کے کمالِ ذات اعدہ بلندِ صفات کا اقرار مضمر ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایک ایسی ہستی کا اقرار رکھتا ہے جو اس کے نزدیک ظلم، ناانصافی اور فعل عبث کے ساتھ متصف ہو تو یہ ہرگز اس ہستی کا اقرار نہیں ہے جو حقیقتاً ان تمام نقائص سے بالاتر ہے خصوصاً جب کہ ہمارا اعتقاد اس ذات سے وابستہ ہوتا ہے۔ صرف ان ہی اوصاف کے ساتھ اشارہ کر کے ورنہ کوئی ذریعہ ہمارے لئے اس کی تعیین کا نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تمام معارف کا سرنامہ خدا کی معرفت ہے جس کو توحید کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ اسلام کا سب سے مقدم مقصد ہے۔ پھر دوسرے درجہ میں ہے رسالت اور تیسرے میں معاد۔

سورۂ قل ہو اللہ شروع سے آخر تک مقصدِ اول یعنی توحید کی مکمل تبلیغ کرتا ہے اس اعتبار سے وہ تمام مقاصدِ قرآنی کی ایک تہائی پر مشتمل ہے اور اس لئے اسے ثلث قرآن کہا گیا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ

یہ خدا کی توحید کی دعوت ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی آواز تھی قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا "کہو کہ کوئی معبود نہیں سوائے خدائے برحق کے تو نجات پاؤ گے" رسالتمآبؐ کی آواز میں ایک اجتماعی شان تھی معلوم ہوتا تھا کہ

آپ ایک مجمع کو مخاطب کر رہے ہیں، قرآن گویا ہر ہر شخص کا شانہ ہلا کر اور
جھنجھوڑ کر اس سے کہتا ہے قُل ھو اللہ احد کہہ کہ وہ اللہ ہے واحد حقیقی۔
اس میں پہلے خدا کی ذات کو کلمۂ ھو کے اشارے سے معین کیا گیا ہے
بات یہ ہے کہ اوصاف کبھی تعین ذات کا فائدہ نہیں دے سکتے۔ ہر لفظ
جس کا کوئی مستقل مفہوم ہے اپنے ساتھ ایک وسعت کی شان رکھتا ہے
مفہوم کے ساتھ مفہوم کی قید لگانے سے کبھی تعین حاصل نہیں ہوتا لیکن
اگر اشارہ کسی خاص ذات کی طرف ہو تو وسیع سے وسیع مفہوم بھی معین
ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ شے، وہ ہستی، وہ موجود، وہ مفہوم وغیرہ وغیرہ۔
یہاں شے، ہستی، موجود اور مفہوم کے الفاظ انتہائی وسیع ہیں مگر صرف
"وہ" کے جزو نے اس کو ایک سے مخصوص کر دیا۔ اس طرح کہ دوسرے
کی گنجائش نہیں۔ دوسرا ذریعہ تعین کا نام لے دینا ہے وہ جو کسی ذات سے
مخصوص ہے اب اگر نام لے کر اس کے مسمّٰی کا پتہ دیتا ہو تو پھر وہی "وہ"
کا لفظ یاد رہ جاتا ہے جو اسے معین بنائے۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ زید
نام کس کا ہے تو یہ اسی صورت پر ممکن ہے کہ اسے لا کر سامنے کھڑا کر دوں۔
اور کہوں یہ زید ہے یا اگر سامنے نہیں تو "وہ" کے لفظ سے اس کی طرف
اشارہ کروں مثلاً وہ جو میرا مطلوب ہے۔ زید ہے۔
خدا کی ذات ہمارے سامنے آ نہیں سکتی۔ اوصاف اس کی ذات کی تعیین

کر نہیں سکتے۔ اب اس کی ذات کی طرف ذہن کو لے جانے کے لئے ایک تو اس کے اسم خاص کا ذریعہ ہے اور وہ لفظ "اللہ" ہے۔ مگر اللہ کے معنی کا جو پتہ دیتا ہے تو پھر غائبانہ ذہنی اشارہ کے سوا صورت ہی کیا ہے اور وہ ہے لفظ "ھو" جو کسی مستقل مفہوم پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ تعیین ہی تعین کے لئے وضع ہوا ہے "قل ھو اللہ احد" نے اس کی ذات کے بتانے کے لئے اسی سے کام لیا ہے "کہو کہ وہ اللہ ہے"۔ اس کے پتہ دینے کے لئے "وہ" سے زیادہ کچھ ہے ہی نہیں۔ اس وہ کے شناسا بنانے کے لئے یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اوصاف کی دنیا میں سمٹ کر حمد و ثنا کے ذوق کو پورا کر لیں۔ مگر یہ اوصاف اس کی ذات تک صرف "وہ" کی حد ہی سے رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ورنہ کہاں وہ اور یہ کہاں لفظوں کی دنیا میں گھڑے ہوئے اوصاف۔ "وہ" نے ذہن کو اس غیب الغیوب ہستی کی طرف متوجہ کیا۔ اور اللہ کے لفظ نے اس کا نام بتلایا۔ پھر احد کے لفظ نے اس کی ذات کے لئے اس کمال کا اظہار کیا۔ جس کی بنا پر وہ سب سے الگ ہے۔ یاد رکھئے کہ یہ احد، واحد کا مترادف نہیں ہے۔ واحد تو اپنے حدود میں ہر چیز ہو سکتی ہے۔ ایک انسان اپنے اجزاء سمیت ایک انسان ہے۔ اور ایک شہر اپنے لاکھوں باشندوں کے باوجود ایک شہر ہے اور تمام دنیا اپنے لاتعداد موجودات کے

ایک دُنیا ہے مگر ان میں سے کوئی چیز بھی احد نہیں ہے۔ احد وہ ایک اکیلا ہے۔ جس میں کثرت کی آمیزش نہ ہو۔ یہ سوائے ایک اللہ کے اور کوئی بھی نہیں ہے۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ

"اللہ وہ مالک و سردار ہے جو سب کا قبلہ، مقصد اور مرکز حاجات ہے۔"

صمد کے یہی معنی ہیں جو ذاتِ الٰہی کے لئے مناسب ہیں۔ بعض لوگوں نے صمد کے معنی قرار دئے ہیں مالا جوف لہ وہ ٹھوس چیز جس میں خول نہ ہو یہ ذاتِ الٰہی کے لئے مناسب نہیں۔

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ

"نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے۔"

اس کے پہلے جو توحید کا بیان ہوا تھا اس پر براہ راست بُت پرستی پر زد پڑتی تھی۔ کیونکہ وہ غیرِ خدا کو محلِ عبادت اور مرکزِ حاجات قرار دیتے ہیں۔ مگر اس فقرہ سے عیسائیت کی رد کی گئی ہے۔ کیونکہ وہ عیسیٰؑ کو ابن اللہ کہتے ہیں۔ اور یہود کا مقولہ بھی قرآن میں درج ہے کہ وہ عزیرؑ کو ابن اللہ کہتے ہیں۔ لم یلد وہ کسی کا باپ نہیں۔ اس سے اس عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے۔ رہ گیا دوسرا فقرہ لم یولد "وہ کسی کا بیٹا نہیں" یہ بظاہر کسی مذہب کی رد نہیں ہے کیونکہ ہمیں نہیں معلوم کوئی ایسا فرقہ جو خدا کو کسی کا بیٹا

سمجھنا ہو۔ بلکہ اس کا تذکرہ اس محل پہ پہلے فقرہ کی مناسبت سے ہے۔ اور اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ خدا کو کسی کا باپ سمجھنا اسی طرح باطل ہے جس طرح اسے کسی کو بیٹا سمجھنا۔ یہ دونوں محالات ہیں اور کوئی صاحبِ عقل تسلیم نہیں کرتا۔

وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ

"اور اس کا مثل و مانند کوئی نہیں" یہ فقرہ توحید کے تمام پہلوؤں کا جامع ہے اس سے ایک طرف بُت پرستی کی نفی مقصود ہے کیونکہ وہ اصنام کو خدا کی طرح محلِ عبادت قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف عیسائیت کی رد ہے کیونکہ بیٹا باپ کا ہم جنس ہوتا ہے اور باعتبار ذات اس کے ساتھ مماثلت رکھتا ہے۔

جب خدا کا کوئی مثل نہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے لئے کوئی بیٹا نہیں۔ تیسری طرف ہر اس مذہب کا بطلان جو خدا کے کسی کمال ذاتی میں دوسرے کو مثل قرار دے خواہ قدامت کے اعتبار سے مادہ و روح کو خدا کا مانند بنانا جو آریوں کا عقیدہ ہے۔ یا افلاک و عقول کو قدیم سمجھنا جو حکمائے قدیم کا عقیدہ ہے یا علم و قدرت وغیرہ اوصاف کو اسکی ذات کے علاوہ قدیم سمجھنا جیسا کہ بہت سی اسلامی جماعتیں نادانی سے قائل ہو گئی ہیں لم یکن لہ کفواً احد ان سب کے ابطال کے لئے کافی ہے۔

سورۂ قل ہو اللہ کے شرعی امتیازات

یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ قل ہو اللہ کو ثلث قرآن کا درجہ حاصل ہے۔ مگر یہ باعتبار مضامین و مطالب اور باعتبار فضیلت ہے اس کا اثر احکام شرعیہ پر کچھ نہیں پڑتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص نذر کرے قرآن مجید پڑھنے کی یا اجیر ہو تو اسے تین مرتبہ قل ہو اللہ پڑھ لینا ہرگز کافی نہ ہوگا۔ پھر بھی قل ہو اللہ کو باعتبار احکام شرعیہ کچھ امتیازات حاصل ہیں۔ نماز میں اگر سورۂ حمد کے بعد قل ہو اللہ پڑھنا چاہتا ہو۔ اور سہو کے سے کوئی دوسرا سورہ شروع کر دے تو اس سورہ کو قطع کر کے قل ہو اللہ احد پڑھ سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی اور سورہ پڑھنا منظور رہا اور اتفاق سے قل ہو اللہ شروع کر دے تو پھر اس کو قطع کر کے کوئی دوسرا سورہ نہیں پڑھ سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہر سورہ کی قائم مقامی کر سکتا ہے مگر کوئی دوسرا سورہ اس کی قائم مقامی نہیں کر سکتا۔ مگر یاد رہے کہ یہ اسی وقت ہے جب وہ اپنے محل میں ہو۔ یعنی سورۂ حمد کے بعد۔ لیکن اگر سورۂ حمد کے بجائے غلطی سے سورۂ قل ہو اللہ شروع کر دے تو اس کو قطع کر کے سورۂ حمد پڑھنا لازم ہے کیونکہ وہ سورۂ حمد کی قائم مقامی ہرگز نہیں کر سکتا۔ سورۂ حمد اپنی خصوصیت میں منفرد ہے۔ اور قل ہو اللہ کو بھی وہ

خصوصیت حاصل نہیں ہے۔

یہ سورہ قل ہو اللہ کی اہمیت ہی ہے کہ اس کے ایک سانس میں پڑھنے کو ناپسند قرار دیا گیا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا مکروہ ان

نقرءُ قل ھو اللہ احد فی نفس واحد

مکروہ ہے یہ امر کہ قل ہو اللہ کی ایک سانس میں تلاوت کرے مطلب یہ ہے کہ اس سورہ کو خصوصیت کے ساتھ رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا چاہیئے۔

مختلف سوروں کی قرأتیں

استحبابی الفاظ کا ضمیمہ

سوروں کی قرآت میں توجہ کو قائم رکھنے کے لئے اور انسان کے قلبی تاثرات کے اظہار کے لئے اکثر سوروں میں الفاظ قرآن کے بعد کچھ فقرات کہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ان کا ذکر احادیث ائمہ معصومینؑ میں موجود ہے اور ائمہ کا عمل درآمد بھی اس پر قائم تھا اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

سورہ قل ہو اللہ امام رضاؑ کا طریقہ تھا کہ جب آپ پہلی آیت قل ہو اللہ احد پڑھتے تھے، اس کے معنی یہ ہوتے خدا کا حکم بندہ کو کہہ دہ

اللہ ایک ہے تو آپ اس حکم کی تعمیل میں چپکے سے کہتے تھے قل ھو اللہ احد سورہ ختم کرنے کے بعد تین مرتبہ فرماتے تھے کذالک اللہ ربنا یہ بندہ کی طرف سے تصدیق ہے اس امر کی کہ جو کچھ سورہ قل ھو اللہ احد میں خدا کے اوصاف مذکور ہیں۔ وہ حقیقت میں اسی طرح ہیں۔ اس بارے میں احادیث متعدد ہیں۔ یہ پہلی حدیث تھی۔ دوسری حدیث امام رضاؑ کی ہے۔ عبدالعزیز بن مہتاری نے آپ سے توحید کے متعلق دریافت کیا حضرتؑ نے فرمایا جو شخص قل ھو اللہ احد کا سورہ پڑھے اور اس پر ایمان لائے اس نے توحید کو سمجھ لیا۔ اس نے کہا اس کے پڑھنے کا طریقہ کیا ہونا چاہیئے۔ حضرت نے فرمایا کوئی خاص طریقہ نہیں۔ جیسے پڑھا جاتا ہے بے شک بعد میں دو مرتبہ کذالک اللہ ربی کا آپ نے اضافہ کیا۔ اس حدیث کو کلینیؒ نے اپنے اسناد سے اور صدوقؒ نے کتاب التوحید میں اپنی مسند سے درج کیا ہے۔

تیسری حدیث امام جعفر صادقؑ کی ہے جس میں آپ نے اپنے والد بزرگوار امام محمد باقرؑ کی سیرت بیان فرمائی ہے۔ کہ جب آپ قل ھو اللہ کی تلاوت سے فارغ ہوتے تھے تو فرماتے تھے کذالک اللہ یا کذالک اللہ ربی۔ چوتھی حدیث فضیل بن یسار کا بیان ہے کہ مجھے امام محمد باقرؑ نے حکم دیا کہ میں قل ھو اللہ پڑھوں اور خاتمہ پر تین مرتبہ کہوں کذالک اللہ ربی

ان احادیث میں نماز اور غیر نماز کی کوئی تخصیص نہیں ہے اس لئے حالتِ نماز میں بھی اس فقرہ کا کہنا صحیح ہے۔ کم از کم ایک مرتبہ۔ اس سے بہتر ہے دو مرتبہ اور افضل تین مرتبہ ہے۔

دوسرے سوروں میں جو الفاظ کہنا چاہئیں وہ ذیل میں درج ہیں:۔

سورۂ والشمس امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے کہ جب سورۂ والشمس کو ختم کرے تو کہے صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ چونکہ اس سورہ کی انتہا حسبِ ذیل الفاظ پر ہے۔

قَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيَاهَا فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا

بندہ صدق اللہ ورسولہ کہہ کر خدا کے وعید اور اس کے پیغمبرؐ کے قول کی تصدیق کرتا ہے۔

سورۂ رحمٰن اس کے متعلق متعدد روایات میں وارد ہوا ہے کہ ہر مرتبہ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ کے بعد کہے کہ لَا بِشَيْءٍ مِّنْ اٰلَائِكَ رَبِّ اُكَذِّبُ

سورۂ والتین خصال میں حدیث اربعمائۃ کے ذیل میں ہے کہ جب سورۂ والتین پڑھو تو کہو وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ۔

چونکہ اس سورہ میں انسان کی خلقت کے تذکرہ کے بعد اس کے انجام کو بتلایا گیا ہے کہ وہ اسفل السافلین میں جائے گا لیکن اگر ایمان اور عمل صالح بجا لائے تو رستگاری حاصل ہو گی۔ آخر میں پوچھا گیا ہے کہ کیا اللہ بہترین حاکم نہیں ہے؟ یہاں پر بندگانِ خدا کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ ہم سب اس کے گواہ ہیں۔

سورہ قل یا ایہا الکافرون امام رضاؑ سے روایت ہے کہ جب آپ قل یا ایہا الکافرون پڑھتے تھے تو آہستہ سے کہتے تھے یَا اَیُّهَا الْکَافِرُوْنَ یہ اسی حکم خداوندی کی تعمیل ہے اور جب سورہ پورا ہوتا تھا تو تین مرتبہ کہتے تھے اَللّٰہُ رَبِّیْ وَ دِیْنِیَ الْاِسْلَامُ

سورہ حمد جب سورۂ حمد کو پڑھ چکے تو پھر کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

(سورۂ اعلیٰ) جب کہے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلیٰ تو آہستہ سے کہے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلیٰ

اس کے علاوہ جب قرآن کی آیت پڑھے اَللّٰہُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِکُوْنَ تو کہے اَللّٰہُ اللّٰہُ خَیْرٌ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اور جب پڑھے ثُمَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّہِمْ یَعْدِلُوْنَ تو کہے کَذَبَ الْعَادِلُوْنَ بِاللّٰہِ اور جب پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا تو کہے اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اور

جب پڑھے اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ تو محمد و آلِ محمد پر درود بھیجے۔ اور جب پڑھے اٰمَنَّا بِاللّٰہِ تو کہے اٰمَنَّا بِاللّٰہِ اور جب تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ پڑھے تو ابولہب کے لئے بددعا کرے اور جب سورہ قیامت پڑھے تو آخر میں کہے سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبَلٰی اور جب پڑھے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تو چپکے سے کہے لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ اور جب پڑھے اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِ الْمَوْتٰی تو کہے سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبَلٰی یہ سب اسی غرض سے ہے کہ انسان آیاتِ قرآنی پر متوجہ رہے اور اس کا اثر اپنے دل میں لیتا رہے۔

قنوت

قنوت کے معنی ہیں دعا کے اور دعا کے لئے نماز میں عام اجازت دی گئی ہے ہر محل پر دعا کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ بارگاہِ الٰہی میں دعا خود ایک عبادت ہے۔ بلکہ حدیث میں وارد ہوا ہے اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ "دعا مغزِ عبادت ہے"

غور کیجئے تو عبادت بے نیاز بارگاہ میں اپنی نیازمندی کا ایک مظاہرہ ہی ہے۔ اور دعا اس نیازمندی اور احتیاج کا ایک عملی ثبوت ہے۔

اسلام نے جو مادیت میں روحانیت کے سمونے کا ایک عظیم نصب العین

اپنے سامنے رکھتا تھا دعا اس کا ایک کامیاب ذریعہ ہے کیونکہ اس طرح انسان اپنے خالص مادی مقاصد کے ذیل میں بھی خدا کو یاد کرنے پر مجبور ہوتا ہے لطف یہ ہے کہ خالص اپنی ذاتی غرض، بشرطیکہ معصیت و گناہ نہ ہو، چاہے وہ انسان کی بہیمانہ خواہشوں کے پورا کرنے ہی کی ہو۔ اگر بطور سوال اس کو اپنے مالک کی بارگاہ میں بندہ پیش کردے تو یہ اس کا پیش کرنا ایک بہترین عبادت اور روحانی اطاعت ہوگا۔

نماز میں یوں تو ہر مقام پر اس کی اجازت ہے مگر ایک مقام خاص طور پر اس کے لئے معین کیا گیا ہے۔ اور وہ رکعت دوم میں دوسرا سورہ پڑھنے کے بعد رکوع کے پہلے کی جگہ ہے۔

یہاں پر جو دعا کی جاتی ہے اسی کو اصطلاحی طور پر قنوت کہتے ہیں۔ اسے بعض علماء تو واجب سمجھتے ہیں۔ مگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنت ہے۔ جس کی پابندی حتی الامکان ضرور کرنا چاہیئے بعض روایات میں اس کے لئے یہ فقرہ استعمال ہوا ہے کہ سُنَّةٌ وَاجِبَةٌ "وہ ایک سنت ہے کہ جو واجب و ضروری ہے"۔

قنوت کے لئے شرعاً کوئی الفاظ نہیں معین کئے گئے ہیں۔ مگر کم از کم حیثیت سے یہ قنوت حدیث میں وارد ہے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَعَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا فِي الدُّنْيَا

وَالْآخِرَةِ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

یہ قنوت مظہر ہے اس اسلامی مقصد کا جسے اس نے بطور مثالیہ اپنے متبعین کے لئے پیش کیا ہے کہ وہ نہ دین کو فراموش کریں اور نہ دنیا کو بلکہ دونوں کی کامیابی کے لئے طلب گار رہیں۔ یہ دعا اسی خصوصیت کی حامل ہے۔

پہلے تو انسان اپنی گذشتہ زمانہ کی عملی کمزوریوں کو یاد کر کے ان کی معافی کی درخواست کرتا ہے۔ "بار الہا، ہم کو معاف کر دے اور ہم پر رحم کر۔" اس کے بعد اپنے مستقبل کی بہتری کا طالب ہوتا ہے کہتا ہے۔ وعافنا واعف عنا اور ہم کو سلامتی عطا فرما اور ہم کو معاف کر دے فی الدنیا والاخرۃ یہ لف ونشر مرتب کے طور پر پہلے دونوں فقروں سے متعلق ہے۔ دو چیزیں وعافنا واعف عنا "ہم کو سلامتی عطا فرما اور ہم کو معاف کر دے" اسی کے متعلق ترتیب کے ساتھ دونوں عالم ذکر کئے گئے ہیں فی الدنیا والاخرۃ "دنیا اور آخرت ہیں۔ دنیا میں سلامتی اور آخرت میں معافی۔ یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ دنیا کی سلامتی سے زاہدانِ پارسا کو تعلق؟ یہ ہرگز درست نہیں ہے کیونکہ وجود حیات صحت وسلامتی سب خدا کی نعمتیں ہیں جو اگر صحیح مصرف میں صرف ہوں تو یہی رضائے الٰہی اور آخرت کی کامیابی کی باعث بھی ہو سکتی ہیں یہ بالکل سطحی نگاہ ہو گی اگر انسان

یہ خیال کرے کہ اس دنیا میں انسان تکالیف میں بسر کرے تو اچھا ہے یا یہ کہ کسی میں
موت آجائے اور دنیا سے چلا جائے تو بہتر ہے اگر یہ بہتر ہی ہوتا تو خودکشی اور
مضر صحت اشیاء کا ارتکاب شرع کی جانب سے جرم نہ ہوتا ان باتوں کے متعلق
پابندیاں عائد کرنے ہی سے ظاہر ہے کہ ہماری زندگی ہماری بقاء اور ہماری سلامتی
اسے منظور ہے اسی لئے زندگی اور صحت پر خدا کا شکر ادا کرنے کا محل ہے۔

بیشک سطحی نگاہ سے دیکھنے پر عارفانِ الٰہی کی یہی شان معلوم ہوتی ہے کہ
وہ دنیاوی راحت و آرام اور خیر و سلامتی کو کچھ نہ سمجھیں مگر خدا کی نعمت کے
قدر شناس ان چیزوں کو بھی اپنے محل پر اہم سمجھتے ہیں۔

ایک مرتبہ شہزادہ کونین حضرت امام حسنؑ سے تذکرہ ہوا کہ ابوذر غفاریؓ
کہتے ہیں کہ میں بیماری کو صحت سے تکلیف کو راحت سے اور تنگ دستی کو دولت و
ثروت سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں۔

امامؑ نے فرمایا کہ جو شخص خدا کے انتخاب پر بھروسہ کرے اسے یہ آرزو نہ کرنا
چاہئیے کہ جس حال میں خدا نے رکھا ہے اس کے سوا کسی حالت کی طرف وہ منتقل ہو
مطلب یہ ہے کہ ہمیں یہ کہنے کا کیا حق کہ بیماری اچھی یا صحت تکلیف اچھی یا
راحت تنگدستی اچھی یا دولت۔ پس جس حال میں خدا رکھے وہی سب میں اچھا ہے
اس لحاظ سے خداوند عالم سے دنیا کے لئے بھی دعا مانگنا چاہئیے اور آخرت کیلئے بھی
اور قنوت کی دعا جو آپ نماز میں پڑھتے ہیں وہ ان دونوں مطلبوں پر

شامل ہے اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ یقیناً تو ہر بات پر قادر ہے چاہے دنیا کے مطلب ہوں اور چاہے آخرت کے سب تیرے ہی قبضہ میں ہیں۔

رکوع و سجود:

سورے پڑھنے کے بعد اور دوسری رکعت میں قنوت کے بعد انسان عظمت الٰہی کے احساس کا زیادہ مظاہرہ کرتے ہوئے جھک جاتا ہے اور کہتا ہے :۔

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ ؎

ہر عیب و نقص سے بری ہے میرے پروردگار کی ذات جو بڑی عظمت والا ہے اور حمد کا مستحق ہے"

رکوع کے بعد سر اٹھاتا ہے خیال ہوتا ہے کہ یہ میرے حمد و ثنا اور تسبیح کا کوئی سننے والا بھی ہے۔ فوراً خدا کے سمیع ہونے کا اعتقاد سامنے آجاتا ہے۔ کہتا ہے

سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ ؎

سنتا ہے خدا اس شخص کی آواز جو اس کی ثنا و صفت کرے" یہ اُس تصور کی تجدید ہے جسے موقف نماز میں آنے کے وقت امام نے پیدا کرنا چاہا تھا۔ ان الفاظ میں کہ تم یقین جانو کہ خدا کے سامنے ہو تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے دیکھنے کا تعلق افعال سے ہوتا ہے یہاں اسی احساس کو پیدا کیا گیا ہے افکار کے متعلق کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس کو خدا سن رہا ہے۔

یہ کہتے کہتے الوہی عظمت و رفعت کا اتنا اثر پڑتا ہے کہ بندہ منہ کے بل زمین پر سجدہ کے لئے گر پڑتا ہے۔

یاد رکھئے کہ رکوع کے بعد ہی بلا فاصلہ اگر سجدہ کا حکم ہوتا تو شانِ تعظیمی اتنی ہی نمایاں ہوتی جتنی اس قیام کی حالت سے سجدہ میں جانے کی صورت میں ہوتی ہے۔ بندہ جتنا جھکتا ہے اتنا وہ خدا کی زیادہ بلندی کا اظہار کرتا ہے رکوع کا درجہ نیم قد تک جھکنے کا تھا۔ اور سجدہ اس کی آخری حد ہے۔ اس لئے ثنا و صفت کے اوصاف میں فرق ہے۔ وہاں تھا سبحان ربی العظیم یعنی اس کو عظیم کہا گیا ہے جس سے عظمت کا اظہار ہوتا ہے اور یہاں ہے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلیٰ وَبِحَمْدِہٖ یعنی اس کو "اعلیٰ" کہا جا رہا ہے جس میں بلندی کی صفت کو زیادتی کے ساتھ ثبت کیا گیا ہے "الاعلیٰ" یعنی بلند ترین اور سب سے برتر"

سجدے سے سر اٹھایا تو خدا کی عظمت کے سامنے اپنے فرائض کی کوتاہی کا احساس ہوا یوں اعتراف جرائم کرتے ہوئے معافی کا خواستگار ہوا اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔ معافی چاہتا ہوں اللہ سے جو میرا پروردگار ہے اور اس کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں" ان گناہوں کی معافی کی درخواست کرنے کیساتھ پھر ایک دفعہ اس آستانۂ عظمت پر پیشانی رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی دوسرا سجدہ کیا اور پھر پہلے کی طرح اس کی بلندی و برتری کا اعتراف کیا۔

تشہد دوسری رکعت کے دوسرے سجدہ کے بعد بیٹھ کر تشہد پڑھنا چاہئے

چونکہ نماز ایک فروعی عبادت ہے جس کی قبولیت وصحت اصول کی صحت پر موقوف ہے عمل کو اعتقاد کی بنا پر ہونا چاہئیے اور اعتقاد کو شروع سے آخر تک قائم رہنا چاہئیے اگر نعوذ باللہ اثنائے نماز میں کسی کے ذہن میں خدا کی توحید یا رسول کی رسالت کے خلاف اعتقاد قائم ہو جائے تو وہ نماز بالکل بیکار ہو جائے گی نماز کے پہلے ان اعتقادات کا تصور، احساس اور اعلان و اظہار اذان و اقامت میں ہو جاتا ہے اس کے بعد نماز کے خاتمہ پر اور اگر چہار رکعتی نماز ہے تو وسط میں بھی پھر ان اعتقادات کی تجدید ہو جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع سے آخر تک عمل اعتقاد کے ماتحت ہے وہ کہتا ہے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ - اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ

"میں گواہی دیتا ہوں کہ نہیں ہے کوئی معبود برحق سوائے اللہ کے وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ اس کے بندۂ خاص اور اسی کے رسول ہیں" یہ بات خاص توجہ کے قابل ہے کہ خدا کی عبودیت کا وہ بلند درجہ ہے جو رسالت سے مقدم ہے اس لئے اس کی گواہی رسالت سے پہلے ہوتی ہے دونوں گواہیوں کے بعد خدا کی بارگاہ میں رسولؐ کے لئے رحمت خاص کی دعا کی جاتی ہے خداوندا اپنی رحمت نازل فرما محمدؐ و آل محمدؐ پر" اس سے اپنے پیشوایان دین کے ساتھ اپنی مخلصانہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

دوسری دو رکعتیں

اگر صبح کی نماز ہے تو وہ دو ہی رکعت پر ختم ہو جائے گی لیکن اگر مغرب کی نماز ہے تو ایک رکعت اور اگر ظہر، عصر، یا عشا کی نماز ہے تو دو رکعتیں اس کے بعد اور پڑھی جائیں گی۔ ان رکعتوں میں اختیار ہے کہ یا سورۂ حمد پڑھے یا تسبیحات اربعہ یعنی سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ۔

ان تسبیحات اربعہ کی عظمت کا بس اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں رکعتوں میں وہ سورۂ حمد کے مدِ مقابل یا قائم مقام قرار پائی ہیں۔

ان کا نام تو تسبیحات ہے مگر حقیقتہً ان میں فقط تسبیح نہیں ہے ان میں تسبیح ہے اور تحمید اور توحید ہے اور پھر تکبیر۔

اور چونکہ انسان کو اللہ کی عظمت اور اس کی حقیقی اوصاف کی معرفت ناممکن ہے مگر اس طرح کہ نقائص اور صفات حدوث کو اس سے دور کرے۔ اس لئے تسبیح کو مقدم رکھا گیا۔ اور دوسری چیزوں کو مؤخر۔

احادیث میں اختلاف کی وجہ سے اس امر میں اختلاف ہو گیا ہے کہ یہ تسبیحات ایک دفعہ پڑھے جائیں یا تین مرتبہ لیکن تین مرتبہ پڑھنے کی صحت میں کوئی شبہ نہیں اور عملدرآمد اسی پر ہے۔

اجزا و ارکان عبادت میں تنوع

جو بات برابر ایک ہی طرح پر ہوتی رہے اور ایک حالت پر قائم رہے

اس کا تعلق دماغ سے قطع ہو جایا کرتا ہے اور تنوع نہ ہونے کی وجہ سے ذہن کو توجہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اگر عمل میں اختلاف و تنوع پایا جاتا ہو اور ہر جگہ کے لحاظ سے کوئی خاص خصوصیت رکھ دی گئی ہو تو انسان کے تصور کی تجدید ہوتی رہتی ہے اور توجہ قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس بنا پر نماز کے اقسام اور ان کے اجزا میں تنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہ باب بہت وسیع ہے اس کے تحت میں نماز کے انواع بھی داخل ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز آیات کی ایک خاص ترکیب۔ نماز عید کی خاص کیفیت۔ نماز جمعہ کا خاص انداز اور نماز یومیہ کی خاص صورت۔ اگر سب نمازیں ایک ہی طرح ہوتیں تو ضرورت نہ تھی کہ نماز پڑھتے وقت یہ تصور بھی پیدا ہو کہ یہ کون سی نماز ہے۔ لیکن چونکہ صورت الگ الگ ہے لہذا لازمی ہو گیا کہ نماز کے وقت انسان کو توجہ پیدا ہو کہ وہ ان میں سے کون سی نماز پڑھ رہا ہے۔ پھر نماز پنجگانہ میں صبح کی نماز دو رکعت ظہر و عصر کی چار رکعت اور مغرب کی تین رکعت اور پھر عشاء کی چار رکعت۔ اگر سب ایک ہی طرح ہوتیں تو ممکن تھا ذہن عمل یہ خاص احساس نہ پیدا ہو۔ کہ یہ صبح ہے، ظہر ہے یا عصر، مغرب ہے یا عشاء لیکن اب تو اس خصوصیت کا لحاظ پیدا ہونا ضروری ہو گیا پھر ان نمازوں میں یہ تفریق کہ بعض جہر سے پڑھی جائیں یعنی آواز کے ساتھ اور بعض آہستہ۔ اس سے اس خصوصیت کی طرف توجہ ناگزیر ہو گئی۔ ظہر اور عصر میں ترتیب اور پھر مغرب اور عشا میں ترتیب کا لازمی قرار دینا بھی تصور اور لحاظ کے قائم کرنے کا بڑا ذمہ دار ہے پھر ان رکعات میں تفریق۔ پہلی اور دوسری رکعت میں سورۂ حمد کے بعد کوئی دوسرا سورہ

پڑھا جائے گا۔ لیکن بعد کی دو رکعتوں میں دوسرا سورہ نہ پڑھے صرف سورۂ حمد پڑھے پھر سورۂ حمد کے ساتھ تسبیحاتِ اربعہ کے پڑھنے کا اختیار دینا۔ اس سے تو لازمی انسان کے ذہن کو متوجہ ہونا پڑے گا کہ مجھے یہاں کیا پڑھنا چاہیئے اس مقصد کے حصول کیلئے میں تو بہت پسند کرتا ہوں کہ انسان ان میں سے کسی ایک کا عادی نہ ہو بلکہ جیسا کہ شرع نے اختیار دیا ہے وہ بھی کبھی سورۂ حمد پڑھا کرے اور کبھی تسبیحاتِ اربعہ۔ کیونکہ اس صورت میں توجہ ضرور پیدا کرنا پڑے گی لیکن اگر وہ سورۂ حمد ہی کا عادی ہو تب بھی میرے خیال میں توجہ پیدا کرنا اس لئے ضروری ہو گا کہ کہیں وہ اس کے بعد دوسرا سورہ نہ پڑھنے لگے

پھر قیام، رکوع، سجود اور قعود کی حالتوں کا اختلاف یہاں تک کہ رکوع اور سجود ہر ایک میں جو تسبیح ہے اس میں الفاظ کے اتحاد کے ساتھ پھر بھی العظیم اور الاعلیٰ کا اختلاف رکھ دیا گیا ہے۔ پہلے سجدہ سے سر اٹھا کر بیٹھنے میں استغفر اللہ ربی و اتوب الیہ اور دوسرے سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد اگر پہلی رکعت ہو تو کھڑے ہوتے بِحَوْلِ اللّٰہِ وَقُوَّتِہٖ اَقُوْمُ وَاَقْعُدُ۔

اللہ ہی کی قوت اور طاقت سے کھڑا ہوتا ہوں اور بیٹھتا ہوں "اور اگر دوسری رکعت ہو تو بیٹھ کر تشہد پڑھے۔ چو رکعتی نماز میں تیسری اور چوتھی میں بھی تفریق۔ غرض یہ کہ کسی حد تک مماثلت اور کسی حد تک اختلاف ہر جگہ قائم رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے اگر ذہن تھوڑی دیر تک غیر حاضر بھی ہے تو پھر اسے واپس آنا پڑتا ہے اور انسان کو تصوّر کی تجدید لازمی ہوتی ہے۔

خاتمۂ نظام یعنی سلام

آخری رکعت میں تشہد کے بعد سلام پھیرنے کا حکم ہے۔

تشہد کے بعد درود پڑھنے کا حکم ہے۔ اور درود کے الفاظ آپ کو معلوم ہیں اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ اس سے حکمِ قرآنی کا اتباع ہوتا ہے۔ کہ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا مگر اس میں صلوات کے سلام کا بھی حکم ہے اس لئے نماز کے خاتمہ کے بعد جب درود پڑھ لیا جائے تو کہا جاتا ہے۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔ آپ پر اللہ کی سلامتی ہو اے خدا کے رسولؐ اور اس کی رحمت ہو اور خاص برکتیں۔

اب حکمِ آیت کی مکمل پیروی ہو گئی۔ رسولؐ پر سلام کرنے کے بعد گویا اُن کے واسطہ سے اپنے برادرانِ دینی کے لئے سلامتی کی دعا کرتا ہے۔ کہتا ہے اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ۔ سلام ہو ہم سب پر اور تمام خدا کے نیک بندوں پر" اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔ "سلام ہو تم پر اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں"

ایک روایت میں ہے کہ کسی نے امیرالمومنینؑ سے پوچھا ما معنیٰ قول الامام السلام علیکم۔

"کیا معنی امام جماعت کے اس کے کہنے کے "السلام علیکم" حضرت

نے فرمایا ان الامام یترجم عن اللہ عزّوجل ویقول فی ترجمتہ لاھل

الجماعۃ امان لکم من عذاب اللہ یوم القیامۃ

(یعنی) امام خداوندِ عالم کی طرف سے ترجمانی کرتا ہے۔ اور گویا نماز

جماعت کے حاضرین کو مژدہ دیتا ہے کہ تمہیں سلامتی اور امان ہے عذاب

خدا سے روزِ قیامت"

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "السلام علیکم" دعائیہ جملہ نہیں ہے۔ بلکہ

خبری جملہ ہے۔ جو بارگاہِ الٰہی کی جانب سے شرکائے جماعت کے لئے

ایک مژدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

فضل بن شاذان کی روایت ہے جو امام رضاؑ سے ہے اس میں ہے

کہ حضرت نے فرمایا

انما جعل التسلیم تحلیل الصلوٰۃ ولم یجعل بدلھا تکبیرا او تسبیحا

او ضربا آخر لانہ لما کان الدخول فی الصلوٰۃ تحریم الکلام للمخلوقین

والتوجہ الی الخالق کان تحلیلھا کلام المخلوقین والانتقال عنھا و

ابتداء المخلوقین فی الکلام اولا بالتسلیم۔

"سلام کو نماز کے اختتام کا ذریعہ قرار دیا گیا اور اس کے بجائے تکبیر یا تسبیح یا

کوئی اور قسم کی چیز اس لئے قرار نہیں دی گئی کہ نماز کے شروع ہونے پر کلام

مخلوقِ خدا سے ناجائز ہو جاتا ہے۔ اور خالق کی جانب توجہ ہو جاتی ہے۔

لہٰذا نماز کا اختتام مخلوق کے ساتھ کلام کے ذریعہ سے ہوتا ہے

اور مخلوق کے ساتھ گفتگو کی ابتدا سلام سے کی جاتی ہے۔

کلام امام کی اس روشنی میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح آپ کہیں سے آتے ہیں اور کسی جماعت پر وارد ہوتے ہیں تو سلام کرتے ہیں۔ اسی طرح سو کر اٹھتے ہیں تو سلام کرتے ہیں اس بنا پر کہ خواب بھی دنیا کی موجودہ اجتماعی حالت سے جدائی کا عالم ہے۔ اسی طرح نماز شروع کر کے گویا تمام آس پاس کے لوگوں سے آپ جدا ہو جاتے ہیں۔ آپ ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ جسے بارگاہِ قدس سمجھا جا سکتا ہے۔ اب جس وقت کہ آپ اس عالم بزرگ سے پھر اپنی دنیا میں واپس آتے ہیں یعنی نماز ختم کرتے ہیں تو نئے سرے سے آپ سے اور پاس بیٹھنے والوں سے ملاقات کی نوبت آتی ہے اس لئے سب سے پہلے آپ سلام کرتے ہیں۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اب اس روشنی میں تھوڑا سا آگے سے آپ نگاہ ڈال لیجئے دیکھئے تو نماز میں ایک عالم صعود نظر آتا ہے اور ایک عالم رجوع اور ان دونوں میں ایک تدریج و ترتیب کی شان ہے جس وقت بندے نے نماز کا افتتاح کیا اور حمد و ثنا کی منزلوں کو طے کرنا شروع کیا اس وقت ایک غیبت کا انداز تھا، گویا وہ ابھی بارگاہِ صمدی سے الگ اور جمالِ قدرت سے اوجھل ہے وہ کہہ رہا تھا:۔

الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم مالک یوم الدین

لیکن جوں جوں ثنا و ستائش کی منزلوں کو طے کرتا گیا حجاب ہٹتے گئے یہاں تک کہ وہ اب جلالِ احدیت کو اپنی نگاہوں کے سامنے پا کر نیاز مندانہ تخاطب کرنے لگا۔ ایاک نعبد وایاک نستعین

پھی سیر ارتقائی جہاں وہ غیبت سے حضور تک پہنچا۔ اب بارگاہِ بے نیاز میں باریابی اور عرض و معروض کے بعد وہ پچھلے پیروں واپس آتا ہے تو وہی تدریجی رفتار اس واپسی میں بھی ہے۔ بڑی بدتمیزی تھی اگر وہ خدا سے کلام کرتے کرتے ایک ہی دفعہ منہ پھیر لیتا اور آدمیوں سے گفتگو شروع کر دیتا۔ اس لئے وہ چپکے چپکے قدم پیچھے ہٹا رہا ہے اس نے چلتے چلاتے اپنے عقائد کی تجدید کی۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔ اس گواہی دینے کے ساتھ اس کو رسول کے خدمات یاد آئے۔ اور ہدایتِ خلق میں آپ کی جانفشانی کا خیال آیا۔ اعترافِ خدمات اور سپاس گزاری کے طور پر اس نے بارگاہِ الٰہی میں آپ کے لئے درود کی عرضداشت پیش کی۔ اللھم صلی علی محمد وآل محمد اب وہ الوہیت محض کے تصور سے ذرا نیچے اتر کر رسالت کی سطح پر نگراں ہو چکا تھا۔ گویا دربار سے رخصتی کے سلسلہ میں عرشِ احدیت سے پلٹ کر کرسئ نبوت کے پاس آ گیا تھا۔ تو اس نے رسولؐ کی طرف رُخ کر کے مخلصانہ سلام آپ کی بارگاہ میں پیش کیا۔

السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایوانِ قصرِ جلال میں رسولؐ کے اعزاز کی کرسی ہے۔ جنھیں مودبانہ تسلیم بجا لاتا ہوا باہر آ رہا ہے۔ یہاں سے ہٹا اور ڈیوڑھی کے پاس آیا تو خدام و حواشی اور ہوا خواہانِ دولت اور اپنے ہم چشموں کا جھرمٹ نظر آیا۔ کہنے

لگا السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عام طور پر کہے جاتے ہیں۔ یہ دونوں سلام مگر واجب ان میں ایک ہی ہے۔ اور میں ان کی ساخت کی بنا پر یہ سمجھتا ہوں اور بعض احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ پہلا سلام السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین تمام افراد مسلمین کے لحاظ سے ہے۔ جو عالم تصور میں اس وقت اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ خواہ نماز جماعت ہو یا فرادیٰ۔ اس لئے سلام کی نوعیت غائبانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اور دوسرا سلام السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ نماز جماعت کے لئے ہے۔ امام کی زبان سے ان ماموین کے واسطے جو اس کے پس پشت ہیں۔ اس لئے اس میں خطاب کا عنوان ہے۔

یہ ہے اسلام کی نماز جو عبودیت الٰہی کے مظاہرات کے ساتھ اپنے بنی نوع کے ساتھ بھی اخلاق اور حسن معاشرت کی سکھلانے والی ہے۔ کاش مسلمان اس عبادت زیبا کو حقیقت شناسی کے ساتھ بجا لائیں۔ اور اس کو صرف ایک رسمی بات سمجھ کر غفلت اور رواداری کے گھڑے میں نہ چھپا دیں؟

(تعلیمی پریس لاہور)